کلب سٹوڈنٹ لائبریری
ہسپتال روڈ صادق آباد
نوٹ: کتاب کے اندر لکھا ہوا نام، کتاب بیچنے
یا ہمیں کتاب واپس کرنے کی صورت میں
بند جلد کرایہ وصول کیا جائیگا
Ph. 068-5704367

فائزہ افتخار

جب آنکھ کھلی

"کڑک مڑک کڑک..... کڑک....."

حسب معمول میری آنکھ مرغیوں کے اس شور شرابے سے کھلی جس دن مرغیاں میری نیند میں خلل ڈالنے سے باز رہتیں۔ اس دن وہ واہیات طوطا اپنے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکالتا۔ کسی ناقابل فہم زبان میں کوئی سبق رٹنے لگ جاتا۔ اگر کسی دن وہ بھی شرافت کے جامے میں رہتا تو اس کھوتے کے پتر کو بھلا کس کا ڈر یا خوف تھا جو وہ چپ رہتا۔ یہ کھوتے کا پتر محاورتاً" نہیں بلکہ حقیقتاً" نہ صرف کھوتے کا پتر تھا بلکہ خود بھی ایک مکمل کھوتا تھا یعنی گدھا۔

"او کتھے پھنس گیا آں....." میں ہر صبح یہ فریاد کرتا۔

"ہاں بھئی امریکہ کے رہائشی کدھر شاہ دی کھوئی نامی آگے پھنس گئے ہیں۔" میری فریاد کے جواب میں کوثر بی بی یہ طنزیہ وار کرنے سے نہیں چوکتی تھی۔

کوثر..... کوثر پروین..... جو اپنی ماں کے لیے "کوثرے" بلکہ "کونثرے" تھی کیونکہ ماں بتولاں کسی بھی لفظ میں "نون" یا "نون غنہ" کو ضرور لازمی سمجھتی تھی۔ چھوٹی والی "فوزیہ" ان کے لیے "فونزیہ" اور ان کے سرتاج یعنی میرے ابا جی، محمد رحمت جنجوعہ کے لیے "فونیہ" تھی اور اگر کہیں میں کوثر پروین کو "کونثر" یا فوزیہ بانو کو "فونیا" کہہ دیتا

مکمل ناول

دونوں پنجے جھاڑ کے میرے پیچھے پڑ جاتیں۔

"چلو اب اٹھ بھی جاؤ" میں نے جھاڑو لگانی ہے صحن میں۔ تو سے دوپہر تک سجی یہ پورے رہتے ہو" نیستی ڈال دی ہے سارے گھر میں۔"

وہ یاسمین کے جنگلوں کا جھاڑو کس کے باندھتی ہوئی بڑبڑا رہی تھی۔ پتہ نہیں اس کی سانولی مگر شفاف سی پیشانی مجھے دیکھتے ہی کیوں سلوٹوں سے اٹ جاتی تھی۔ امی کے پتے جیسے ہونٹ ہمہ وقت ہل ہل کر کچھ نہ کچھ بڑبڑاتے رہتے، بھی یہ بڑبڑاہٹ میرے سر سے گزر جاتی اور بھی سمجھ میں آجاتی اور جب سمجھ میں آجاتی۔ یہی سوچتا کہ نہ ہی سمجھتا تو اچھا تھا۔

"دوپہر تک سوتا ہوں" یہ نظر آتا ہے، آدھی رات تک منجی ہلی پڑی رہتی ہے" یہ نظر نہیں آتا۔" میں نے تنک کے پوچھا۔

"مجھے کیا ضرورت ہے آدھی آدھی رات کو اٹھ کے تمہاری منجی پہ نظر ڈالنے کی۔" اس نے بھی تنتاکر جواب دیا۔

"سوا نو ہوئے ہیں۔" میں نے تکیے کے نیچے سے اپنی گھڑی نکال کے وقت دیکھا۔

"پتا نہیں دوپہر کے کہتی ہو تم۔ اچھی طرح پتا ہے کہ میری رات کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ صبح اذان کے وقت آکے سوتا ہوں۔"

"یہ تو اور بھی نحوست والی بات ہے۔ لوگ اذان کی آواز سن کر جاگتے ہیں اللہ کا نام لینے کی تیاری کرتے ہیں۔ تم اذان سن کر سونے کی تیاری کرتے ہو۔ جب اس وقت جاگ ہی رہے ہوتے ہو تو نماز پڑھ کے سو جایا کرو۔ فجر کی چار رکعتیں پڑھنے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔"

یہ موضوع ایسا تھا جس پہ میری بولتی بند ہو جاتی تھی۔ ہاں نماز کے معاملے میں مجھ سے کوتاہی ہو جاتی تھی لیکن ابھی دل اتنا سیاہ نہیں ہوا تھا کہ اس کے لیے ناولیں گھڑ کے خود کو حق پہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ جب بھی کوئی احساس دلاتا "میں جی بھر کے شرمندہ ہو جاتا لیکن کوثر پروین کا معاملہ اور تھا۔ اس کے سامنے شرمسار ہو کر سر جھکانے کا مطلب تھا کہ اسے اور شیر کرنا" اس لیے میں ہر بار اس کے طعنے کے جواب میں وہی کچھ دہراتا جو عموماً "نماز نہ پڑھ سکنے والے" نمازیوں کا پٹڑا بکا کرنے کے لیے کہا کرتے ہیں۔

"اور تم جو پانچ وقت نماز پڑھ لیتی ہو تو کون سا تیر مار لیتی ہو۔ دل تو تمہارا سازشی اور منافق ہے۔ جب تک تم مخلوقِ خدا کے ساتھ زیادتیاں کرنا بند نہیں کرو گی، تمہاری ساری باتیں بے فائدہ ہیں۔"

چارپائی کے نیچے سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے اپنی چپل برآمد کرتے ہوئے میں نے اس کا منہ بند کرانا چاہا۔

"تم منشی لگے ہوئے ہو میرے فرشتوں کے..... جو تمہیں سارا حساب کتاب پتہ ہے کہ میری کون سی عبادت قبول ہوگی اور کون سی نہیں۔"

وہ تڑپ کے بولی۔ چہرے پہ پسینہ کچھ اور بھی چمکنے لگا۔ جھاڑو کا رستہ اینٹوں کے فرش پہ زور سے ٹھوکتے ہوئے اس نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"یوں تو چاچا ٹائم پاس بھی تین چار وقت کا نمازی ہے اور میں کل ڈاس کے محلے میں آیا ہوا اس کے سارے کرتوت جانتا ہوں۔ تم کون سا بے خبر ہو گی" یہ دیوار کے ساتھ تو دیوار لی ہے۔"

اب میں صحن میں بنے "کھرے" پہ لگے سرکاری نل کے پاس بچوں کے بل بیٹھا منہ پہ لال صابن سے جھاگ بنا تا اسے اور کلارا تھا۔

"آگے پیچھے تو چاچا ٹائم پاس کی بڑی حمایتیں ہوتی ہیں۔ آج اس کے کرتوت یاد آگئے۔ تم سے تو لاکھ درجے اچھا ہے۔ بندوں کے ساتھ اس کے معاملے جیسے بھی ہوں اللہ کو تو نہیں بھولتا نمازی ہے۔"

"ہاں پون، ڈھائی نمازیں پڑھ لیتا ہے مگر حقوق العباد کی بھی بڑی اہمیت ہے پی ٹی کو سنتر۔"

میں نے نام کے ساتھ "نون غنہ" ٹھونس کر اسے اشتعال دلانا چاہا۔

"اب دیکھو، صبح صبح اپنے ہم جولیوں سے کورس گیت گوا کر سی کے تھکے ہارے مزدور بندے کو اس کی نیند سے جگانا کوئی نیک کام ہے۔ مرغیوں کی کڑک کڑک، طوطوں کی مَیں مَیں، کتے کی بھوں بھوں..... گدھے کی دُھینچوں دُھینچوں۔"

"اور ان سب سے مقابلے کے لیے ایک تمہاری "نڑ" کافی ہے۔"

میں تلملاتا کے پیچھے مڑا اور اسے گھورنا چاہا مگر اس کو شش میں اس کا تکیہ کچھ نہ بگڑا" ال صابن کا جھاگ میری داہنی آنکھ میں چلا گیا۔ دل کی طرح میری آنکھ بھی جل گئی۔

"اکھ لڑی تے لڑائی جاچپ کر کے....."

اب دیوار پار سے چاچا ٹائم پاس کی رگِ موسیقی پھڑکی تھی، ان کا پھٹی آواز والا ٹیپ ریکارڈر بے ہودگی پر اتر آیا تھا۔

"فلم اپنی بنائی جاچپ کر کے....."

میں گرم پلتے پانی سے جھیا کے مارمار کے اپنی آنکھ سے صابن نکالنے لگا۔ دوسری جانب اس بکواس گانے کی بے ہنگم لے پر کوثر کے ہاتھ کچھ زیادہ ہی تیزی سے چلنے لگے۔ پورے صحن میں اس نے گرد اور دھول اڑا کے رکھ دی تھی۔ پتہ نہیں یہ صفائی کا کون سا نیا طریقہ تھا کہ زمین کی مٹی اٹھا کے فضا میں آلودگی پھیلائی جائے۔

"کوئی حساب تو لیہ نہیں ہے؟" گھر سے نسواری تولیے سے دور ہی سے آتے بھکے سے کھرا کے میں نے پوچھا۔ تولیہ بھی نہانے کب سے نہیں دھلا تھا۔ اکڑ کے ریگ مال جیسا کھردرا ہو رہا تھا۔ منہ کو خشک تو کیا کرتا، چھیل کے رکھ دیتا۔

"ہے..... مگر گندا نہیں کروانا" اس لیے نہیں نکالوں گی۔" اب وہ جھاڑو جمعن کے درخت کے تنے کے ساتھ کھڑا کرنے کے بعد نل کے نیچے بیٹھ کر پونچھا لگانے والا کپڑا دھب دھب کر کے دھونے لگی۔ میں وہیں کھڑا تھا، کئی چھینٹے اڑ کے میری شلوار تک آئے۔

"اے..... آرام سے..... تمیز نہیں ہے کام کرنے کی۔ سارے گندے چھینٹے میرے کپڑوں پہ لگا دیے۔"

"تو تم نے کون سا نماز پڑھنی ہے نہ اشنان کر کے دوبارہ منجی پہ پسرنا ہے۔ کپڑے ناپاک بھی ہوں تو یہ کام آرام سے ہو سکتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی منہ توڑ جواب دیتا" ماسی بتولاں سبزی کی ٹوکری اٹھائے باہر کی کنڈی اندر داخل ہوئی۔

"لوجی بنی خیر"

ماسی نے آتے ہی پھولی سانسوں کے ساتھ اعلان کیا اور یہ یہ اعلان ہر روز تازہ سبزی لانے کے ساتھ ہی کیا کرتی تھیں۔ سبزی تازہ نہ ملے خیر یں روز تازہ یہ تازہ اور نئی سے نئی ہوتیں۔ یہی حال ان کی چھوٹی صاحبزادی فوزیہ بانو

عرف "فوجیا" کا تھا۔ وہ بھی اسکول سے چھٹے کچھ سیکنڈ کے آئے نہ آئے راستے سے خبریں ضرور اکٹھی کرا لایا کرتی۔

"چاچے نیم پاس نے نئے کرائے دار "لب" (ڈھونڈ) لیے ہیں۔"

یہ دھماکا کرنے کے بعد وہ خود بھی چارپائی پہ گر کے دھما کا ہو گئی۔ میری کراہ نکل گئی۔ ابھی پرسوں میں نے اپنی بیان کی اس چارپائی کو کس کسا کے سونے کے قابل بنایا تھا۔

"ہائے ہائے" کون بدبخت بیٹھے چڑھا؟"

باہیں جانب کی دیوار سے باجی ساجدہ کا سر نمودار ہوا۔ یہ بھی عجیب و غریب کریکٹر تھا۔ دائیں جانب چاچا نیم پاس کا گھر تھا تو بائیں جانب بھا حنیف رہائش پذیر تھے۔ بھا حنیف خیر سے مولوی ٹائپ بندے تھے۔ اپنی بیگم جو محلے بھر میں باجی ساجدہ کے نام سے مشہور تھیں ان کو پردہ کرانے کی اپنی سی کوشش کرتے تھے۔ گھر سے باہر واجب نکلنے پہ پابندی تھی جس کا مداوا کرنے کو دیواروں سے لگا کرتی تھیں۔ چونکہ خود خبریں اکٹھی نہیں کر کے لا سکتی تھیں، اس لیے کان یہاں لگے رہتے جیسے ہی ماسی سبزی لے کر یا فوزیہ اسکول سے لوٹتی، وہ تازہ بلیٹن سننے کے لیے نمودار ہو جاتیں بلکہ وہ نہیں، صرف ان کا دوپٹے سے نصف ڈھکا رنگ برنگ کلیوں سے سجا ہوا سر۔

"یہ تو چاچی نیں پُر ریڑھے سے سامان اتر تا دیکھا ہے اور پتہ ہے ساجدہ، تین تین سنگھار میز تھے سامان میں۔"

اس انکشاف سے باجی ساجدہ کی آنکھیں کاجل کے تالاب سے ابھر کے باہر نکل آئیں۔

"تین تین سنگھار میزیں۔ یعنی ڈریسنگ ٹیبل....."

باجی ساجدہ آٹھ تو جماعتیں پڑھی ہوئی تھیں اس لیے انگریزی کا انگریزی ترجمہ کرنا بھولتیں۔

"آہو..... ساروں کے شیشوں کے ساتھ پرانے لٹکے ہوئے تھے" وہ بھی سلمٰی ستارے اور تلے والے۔ لگتا ہے بہت ساری جوان کڑیوں والا نہ ہو تو یہ یا کسی شوقین مزاج فیشنی زنانی کا سامان ہے۔"

"اللہ سنگھار میز کو کیا کرے گا۔ چاچا ٹائم پاس کو بھی ٹائم پاس کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی مل ہی جاتا ہے۔"

"مل نہیں جاتا مل جاتی ہے۔"

میز حیاں اترتے ہوئے سلمان نے باجی ساجدہ کے اس بیان میں اضافہ کیا۔

یہ حضرت ماسی بتولاں کے سب سے بڑے اور اکلوتے صاحبزادے تھے۔ اس محلے اور ہمارے خاندان کی روایات کے برعکس ماسی بتولاں نے صرف تین عدد شادیاں کیے تھے۔ حالانکہ وہ خاصی روایت پسند خاتون تھیں پھر پتہ نہیں یہ روایت شکنی کیسے کر ڈالی انہوں نے۔ سلمان کا پورا نام محمد سلیمان جنجوعہ تھا مگر وہ خود کو سلمان خان کہلوانا پسند کرتا تھا اور اس مسئلے پہ ماسی بتولاں اور مامارحمت کے مابین کئی بار شدید نوعیت کا تنازعہ بھی پیدا ہوچکا تھا اور ہر بار ماسی نے روتے پیٹتے ہوئے سلمان کو دھمکی کے جڑے تھے۔

"دے ہیڑ ترپا... پوتیرا محمد رحمت جنجوعہ، دادا کرم دین جنجوعہ..... تو کدھر سے خان پیدا ہوگیا ہے' بڈھے ویلے میرے سر میں" کے "ڈالوانے۔"

سلمان جنجوعہ المعروف سلمان خان کو دوہی شوق تھے' ایک تو اپنے آئیڈیل ہیرو کی طرح بغیر شرٹ کے پھرنا اور دوسرے اسی آئیڈیل ہیرو کی طرح آئے دن جیل کی ہوا کھانا۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ مامارحمت کا بنتوں یعنی سلمان کا پھپھو سنترپی بادشاہ ہے۔ یعنی تھانیدار ہے' اس لیے یہ ہوا زیادہ دن کھانے کی نوبت نہیں آتی۔ ویسے بھی اب تک وہ کسی ایسے سنگین کیس میں اندر ہوا بھی نہیں کہ بات آگے تک جاتی۔ یعنی چوری چکاری' ڈکیتی' راہزنی' قتل وغارت یا منشیات کی اسمگلنگ وغیرہ۔ وہ عموماً" کسی نہ کسی گرلز اسکول یا گرلز کالج کے آگے کھڑے لونڈوں کے آپریشن کلین اپ کے دوران پکڑا جاتا تھا۔

"تم تو منہ بند ہی رکھو۔ ساری تمہاری پھیلایئی ہوئی افواہیں ہی ہیں۔" کوثر نے اپنے سے نقطہ تیرہ ماہ بڑے بھائی کو ڈپٹ کر خاموش کرایا۔

"اچھا..... یہ افواہیں ہیں؟ سارے محلے کو پتہ ہے چاچا ٹائیگر اس کے کرتوتوں کے بارے میں۔ تمہیں پتا نہیں کیوں اس کی ہمدردی کا بخار چڑھتا ہے۔ اماں! اس کا ماجنا بند کراؤ وہاں۔ بھی کڑھی دینے تو کبھی پراٹھے پکڑانے پہنچی ہوتی ہے۔ چاچا بھی کوئی اعتبار کا بندہ ہے؟؟"

"نہ پتراتریا بھی کوئی بات نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ چاچا ٹائیگر اس عورتوں کے معاملے میں ذرا کچے ایمان کا ہے لیکن محلے کی بچیوں پہ اس نے کبھی نیت خراب نہیں کی۔ ساری اس کے سامنے پل کے بڑی ہوئی ہیں۔ اپنی کو نہری اور فوجیز تو اس کے کاندھوں پہ بیٹھ کے اسکولے جایا کرتی تھیں۔"

"وہ تب کی بات تھی' میں اب کی بات کررہا ہوں۔ ان باتوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا اور وہ بھی چاچا ٹائیگر ایس جیسے بابے۔ پہلے والی کرائے دارنیوں کے ساتھ اس کے قصے یاد نہیں؟"

اور اس کے بعد چاچا ٹائیگر پاس کے ان تمام بھولے بسرے قصوں کو تازہ کیا جانے لگا جو میں اپنے اس گھر میں پچھلے چھ ماہ کے قیام کے دوران بلا مبالغہ کم وبیش بیس مرتبہ سن چکا تھا۔ اب تو مجھے بھی ایسا لگنے لگا تھا جیسے یہ سارے واقعات میری آنکھوں کے سامنے گزرے ہوں۔ اگر مجھے خود کسی کو بتانا پڑیں تو میں ایسے ہی دُہرا سکوں گا جیسے ماسی بتولاں' باجی ساجدہ اور خود سلمان خان چکے لے لے کر ایک دوسرے کو سنارہے تھے۔

☆ ☆ ☆

میں حیدر' حیدر بخت چوہدری سکندر ڈونگہ بونگہ' بی اے پاس سیکنڈ ڈویژن۔ پچھلے چھ ماہ سے لاہور کے علاقے شاہدرہ کی کھوئی میں بنے اس پختہ اور نیم پختہ مکان میں رہائش پذیر ہوں۔ کیونکہ یہ مکان میری رشتے کی خالہ اور دور دراز کے ماموں کا ہے اور ہماری خاندانی روایات کے عین مطابق رشتے داروں کا جس حد تک استعمال ہوسکے اور ان سے جتنا بھی فائدہ اٹھایا جاسکے' ضرور اٹھانا چاہیے۔

مجھے بھی جب لاہور میں نوکری ملی تو بے بے کا سب سے پہلا فرمان یہ تھا۔

"کوئی ضرورت نہیں اپنی ساڑھے تین ہزار کی تنخواہ میں سے کرائے بھرنے کی۔ ویسے بھی تیری رات کی ڈیوٹی ہے' رات تو تیری کارخانے میں گزر جانی ہے' دن تھوڑی دیر سو کر تھوڑی دیر گھوم پھر کے گزر جائے گا۔ تو میری چاچے کی دھی' بتولاں کے گھر ہا۔ وہی۔۔۔ وہی تیری لاہور والی ماسی' یاد نہیں۔ ناؤ وڈے کی پوتری کی شادی پہ جو جامنی جوڑا پہن کے آئی تھی۔"

اب ناؤوڈے کی آخری پوتی کی شادی کو بھی تقریباً" نو سال ہورہے تھے۔ میں نے یاد داشت پہ زور ڈال کے جامنی جوڑے والی خالہ کا تصور کرنا چاہا مگر ناکام رہا۔

"ہائے ہائے وہی۔۔۔ وہ جوہین بڑا اچھا ڈالتی ہے۔ کسی کے گھر موت ہو "پھوڑی" (ماتم) وہی سجاتی ہے۔ یہ الگ بات کہ اپنی ساس کے مرنے پہ اسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ حرام ہے جو ایک ٹھوتا آنسو بھی گرایا ہو۔"

"اچھا اچھا۔۔۔ مجھے یاد آیا۔۔۔ بے بے کی کسی چاچی کی وفات پہ ہم لوگ برسوں پہلے لاہور گئے تھے۔"

"وہ والی ماسی..... جو کہہ رہی تھیں کہ ساس کی ایک اچانک موت کی وجہ سے مجھے سکتہ ہوگیا ہے اور اس سکتے کا اعلان وہ خود اپنی زبان سے کررہی تھیں اور سارے گھر میں پھرکی کی طرح گھوم پھر بھی رہی تھیں۔"

"ہاں ہاں وہی..... تو کیا کرتی بے چاری۔ اب رونا جو نہیں آرہا تھا تو کیا کہتی۔ جیتے جی چاچی اللہ بخشے نے جتنا رلانا تھا' رلالیا۔ بس تو اور چلا جا۔ بتولاں اچھے مزاج کی ہے پھر صرف وہی میری بہن نہیں لگتی' اس کا خصم' یا رحمت بھی دور کے رشتے سے میرا بھائی ہی ہے۔ میرا ماما لگتا ہے' وہ تو اپنی زنانی سے بھی زیادہ بھلا مانس ہے۔ بچے بھی تین ہی ہیں۔ بے چاروں کے لڑکا ہوگا کوئی نہ سے دو تین سال چھوٹا اور اس کے بعد دو چھکلی جیسی سوکھی ماری پیلی پیلی لڑکیاں تھیں۔ ہورے کیا نام تھے خاصا وقت بھی تو ہوگیا ہے ملے ہوئے۔"

"اتنے سالوں سے آپ ان سے ملی نہیں' نہ وہ ہمارے گھر کبھی آئے۔ خاندان برادری میں کسی شادی یا مرگ پہ ملاقات ہوئی ہو تو ہوئی ہو۔۔۔ اس پہ بھی آپ کا اصرار ہے کہ میں ان کے ہاں جاکے ڈیرے لگاؤں۔ پتہ نہیں ان لوگوں کا رویہ کیسا ہو۔ شاید وہ پسند نہ کریں' ناک بھوں چڑھائیں۔"

"لعنت بھیجو تم ان کے ناک بھوں پہ۔ ڈھیٹ بن کے گزارا کرلینا۔ پتر آج کل اپنا کام نکلوانے کے لیے بندے کو ڈھیٹ بننا ہی ہوتا ہے پھر تو ڈنکے کی چوٹ میں گھنٹے کے سر پہ سوار رہتا ہے۔ اپنا کام دھندہ کرنا ہے۔ مروت سے' سارا دن کوئی سر کو تو نہیں گزارے گا۔ لاہور شہر ہے' روز شام کو نکل جایا کرنا گھومنے پھرنے۔ اگر روٹی پانی پوچھتی ہے تو ٹھیک ہے' سو سہی اللہ۔ کوئی احسان نہیں ہوگا اس لوگ رشتے داروں کو مہمان بنایا ہی کرتے ہیں اور اگر لا الت دکھائے' نہ دے کھاتا تو دفع دور۔ کسی تندور سے دو کلو روٹی کھا لینا مگر کرائے پہ ابھی کمرہ نہ ڈھونڈنا۔ بڑا منحوس شہر ہے بھئی۔ تیری آدھی تنخواہ تو اسی میں برابر ہوجائے گی۔"

بے بے نے مجھے پٹیاں پڑھا کر لاہور روانہ کیا تھا۔ لاشعوری طور پر میں بھی گویا کسی اکھاڑے میں اترنے کے لیے تیار تھا مگر یہاں آکر میرا سارا سازوسامان دھرا کا دھرا رہ گیا۔ ڈھٹائی کا مظاہرہ کرنے کے سارے ارمان دل ہی میں رہ گئے۔ ماما رحمت اور ماسی بتولاں دونوں ہی بڑے دل اور کھلے باہوں کے ساتھ مجھے خوش آمدید کہا تھا۔

یہ ایسا ہی محلہ تھا جیسا ذرا پتلے حال والے متوسط طبقے کا ہوتا ہے۔ زیادہ تر لوگ محنت مزدوری کرنے والے تھے۔ چند ایک عورتیں بھی دوسروں کے گھروں میں کام کرنے جایا کرتیں مگر انہیں قدرے خوشحال محلے دار اچھی نظروں سے نہیں دیکھا کرتے تھے۔ یعنی طبقاتی فرق اس محلے کی حدود میں بھی پایا جاتا تھا۔ اکا دکا گنتی کے چند گھرانے جو سب سے معزز اور خوشحال سمجھے جاتے تھے' ان میں ایک ماما رحمت اور ماسی بتولاں کا گھر تھا۔ ماما رحمت کی اپنے آبائی قصبے لودھراں میں بھی زمینیں تھیں' بہت زیادہ نہیں مگر ان کے بھائی' جو ہمارے ان کے حصے کی آمدنی اور اناج کا حصہ بھیجا کرتے تھے' وہ آس پاس کے لوگوں پہ ان کی زمینداری کی دھاک بٹھانے کے لیے کافی تھا۔ خود وہ نگہداری کرتے تھے۔ اسی محلے میں روڈ پہ ان کی کریانے کی دکان بھی۔ بنا ہے پہلے بیس گلی میں چھوٹا سا کھوکھا ہوا کرتا تھا۔ اب ترقی دے کر جنرل اسٹور بنا لیا تھا۔ ٹھنڈی بوتلیں اور جوس رکھنے کے لیے ڈیپ فریزر تو میرے سامنے فٹ ہوئے تھے۔ ماسی کسی زمانے میں اُجرت پہ سلائی کڑھائی کا کام کرتی تھی' اب چھوڑ رکھا تھا۔ بڑے صاحبزادے بھی دکان پہ بیٹھے' کبھی کبھی نہ بیٹھے..... کبھی چھت سے اترے' کبھی نہ اترے۔ کوثر پروین میٹرک میں نیسر کی بار فیل ہونے کے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے ہدیہ کا تحفہ حاضر ہے

خوبصورت و مقبول ناول

• ہیرو کی محبت کی پہلی سیڑھی ہیروئن کی نفرت ہوتی ہے 50/- • لاحاصل محبت کی داستان 150/-
• ایک وہ جو ملنے کو تھا ملا تھا 50/- • شہر دل کے دروازے 250/-
• چاند دیس میں دل ایک تنہا مسافر ہے ٹاک خٹک خٹک • غیر ملکی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک خوبصورت ناول 150/-
• خوبصورت سرورق • خوبصورت چھپائی • مضبوط جلد • آفسٹ پیپر

شائع ہوگئے ہیں

آج ہی منی آرڈر بک اسٹال یا سالانہ خریداری فارم منگوا کر ہمارے ایجنٹ بنیے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ 37 فرید پلازہ، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی
فون: 7216361

بعد بھی شاید ہمت نہ ہارتی مگر ماسی کی نظر جواب دے گئی تھی۔ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لیے اسے اسکول سے ہٹانا ہی پڑا۔ مجھے کبھی بھی لگتا ہے کہ اسی وجہ سے چار سال پہلے جو ثمر پردیس کا موڈ خراب ہوا تھا' اب تک خراب ہی ہے۔ میں نے بھی اس کا ساتھ سلوٹوں سے پاک نہیں دیکھا۔ چھوٹی سی خوبصورت ناک اپنے اونچے سمیت ہر وقت اوپر ہی چڑھی رہتی ہے۔ فوزیہ باتو اگرچہ اسکول کی طالبہ ہے مگر گوشت سے کوئی بہت سال چھوٹی نہیں۔ یہی کوئی تین چار سال کا فرق ہوگا۔ عمر کے لحاظ سے اسے اب تک انٹر میں ہونا چاہیے تھا یا انٹر پاس کرلینا چاہیے تھا مگر اس کی نوبت تو تب آتی' جب وہ میٹرک پاس کرپاتی۔ اپنی ہشیرہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ بھی پچھلے دو سال سے اسکول کی آخری جماعت میں گونددے پیلی ہوئی تھی اور اس سال بھی اس کا یہاں سے ٹس سے مس ہونے کا کوئی ارادہ نظر نہ آرہا تھا۔ پڑھائی کی بجائے اس کا اہل خاندان اور محلے میں ہونے والی تازہ ترین سرگرمیوں میں زیادہ دلچسپی لینا اضافی صلاحیت کی وجہ سے ماسی نے اسے اپنا اسسٹنٹ مقرر کر رکھا تھا۔

اس کے علاوہ بھا حنیف کا گھرانہ ہے جو ان کی بزرگ والدہ بیگم المعروف ساجدہ باجی اور چودہ سے ڈیڑھ سال تک کے پانچ بچوں پر مشتمل ہے۔ بھا حنیف ٹیلی فون کے محکمے میں کام کرتے ہیں۔ عہدہ تو خاص نہیں۔ سرکاری تنخواہ بھی بس گزارے لائق ہے' اسی پہ اکتفا کرتے تو سفید پوشی کا بھرم بھی بہ مشکل رکھ پاتے لیکن اپنی تمام تر نمازوں' بردے کی پابندی اور ہاتھ میں تھامی تسبیح کے باوجود اپر کی آمدنی کو خاص برا نہیں سمجھتے' اس لیے گھر میں آسودگی کی ریل پیل ہے۔ بالچوں بچے اس علاقے کے سب سے اچھے انگلش میڈیم اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ نیا چمچما تا ہنڈا موٹر سائیکل تھا۔ گھر کی دوسری منزل میں دو سال پہلے ہی تین کمرے ڈال کے باہر رنگین ٹائلیں بھی لگوالی تھیں۔

ایک چاچا جیم پاس تھے جو تنے کو کھانے پینے' خوشحال قسم کے گھریلو مارحمت اور بھا حنیف کی طرح محلے میں بااعزت نہیں سمجھے جاتے تھے۔ ویسے انہیں اپنی عزت کروانے کا خاص شوق بھی نہیں تھا' ورنہ کوئی تو عزت کروانے لائق کام کرتے۔

چاچا کا مکان اردگرد کے مکان کے مقابلے میں خاصا بڑا اور کشادہ تھا یا شاید لگتا تھا کیونکہ اس نے دوسرے لوگوں کی طرح ہر دو سرے سال کسی نئے کمرے کا اضافہ نہیں کیا تھا' نہ ہی کمروں کے اوپر کمرے چڑھائے تھے۔ پرانے بنے وہی تین کھلے کھلے اور اونچی چھتوں والے کمرے۔ سامنے رنگین خانے والے فرش کا برآمدہ..... اس کے آگے گئی' ادھڑی ہوئی جقیبی اور سامنے کھلا سا صحن اور کچا احاطہ..... لال اینٹوں والے صحن میں ہینڈ پمپ لگا تھا جو آج کل کے زمانے میں بچوں کے لیے ایک عجوبہ تھا۔ کیاروں میں عجیب و غریب بدشکل جھاڑ جھنکاڑ پودے اُگے تھے جو یقیناً چاچا کی اجازت طلب کیے اور مرضی دریافت کیے بغیر خود ہی اُگ آئے تھے۔ ورنہ چاچا انہیں اس دخل در معقولات کی اجازت ہرگز نہ دیتا۔ بچے احاطے میں مرغیوں' بطخوں' خرگوشوں اور گدھے سے نمل کے کمال کا گند مچایا ہوا۔ سارے محلے میں پھیلی مکھیاں اور مچھر اسی احاطے میں نمپانے کے بعد اپنے پیروں پہ کھڑے ہوتے تھے۔

چاچا کی چھڑا چھانٹ تھا۔ پیدائشی نہیں' حادثاتی طور پر۔ نزدیک کے سب ہی رشتے جان چھڑا چکے تھے۔ شادیاں دو تین بار بڑے چاؤ سے کیں مگر گھر آباد نہ ہوسکا۔ بچہ کوئی اللہ نے دیا ہی نہیں۔ اولاد کی کمی وہ اپنے پالے ہوئے بے زبان جانوروں سے پوری کرلیتا اور بیوی کی بھی..... وہ بھی پوری کرنے کی اپنی سی کوشش کرتا ہی رہتا مگر محلے والے آڑے آتے تھے۔ خود ایک کمرے میں رہتا باقی دونوں کمرے زیادہ تر کرائے پہ چڑھے ہوتے مگر کوئی بھی کرایہ دار چند مہینوں سے زیادہ ٹکتا نہیں تھا۔

پچھلے محلے میں اس کے دو تین اور کوٹھری نما مکان کرائے پہ چڑھے ہوئے تھے وہاں جو نکہ کرائے داروں کا اس سے روز کا واسطہ نہیں تھا' اس لیے دل کڑا کر کے ڈنے ہوئے تھے۔ ویسے بھی وہ محلہ کچھ زیادہ ہی غریب غربا کا تھا۔ زیادہ تر چھڑے چھانٹ مزدور پیشہ لونڈے لپاڑے رہتے تھے۔ کوئی دیہاڑی دار مزدور' کوئی پھیری لگانے والا..... دو چار مل کے ایک کوٹھری کرائے پہ لے لیتے۔ یوں جہاں عورتوں کا عمل دخل نہ ہو' وہاں چاہے ٹیم پاس کا نہ تو ٹیم پاس ہوتا ہے' نہ کوئی دوسرا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔

چاچے کے مکان کا ایک پچھلا دروازہ اس گلی میں بھی کھلتا تھا جسے کھولنے کی نوبت عموماً مہینے کے شروع کے دنوں میں آتی۔ جب کرائے کی وصولی کرنا ہوتی' ورنہ دوسرے دنوں میں اس کی جھلنگا سی چارپائی اسی دروازے پہ مورچے کی طرح پڑی رہتی اور وہ آتی جاتی عورتوں کی آنکھ میں خاری طرح کھٹکتا رہتا۔

بے شک اپنی نجوبی اور درویشانہ طرز زندگی کی وجہ سے وہ برے حالوں میں رہتا تھا لیکن تھا تو صاحب حیثیت' صاحب جائیداد اور پھر محلے بھر میں اسے اچھی نظر سے کیوں نہیں دیکھا جاتا۔ یہ سوال ابتدا میں مجھے خاصا تنگ کرتا تھا۔ ماسی کے گھر میں بھی اس کی خاصی وقعت نہ تھی لیکن نصیب سے وہ ماسی کا دور کے چاچا لگتا تھا۔ اب رشتے داری تو ختم نہیں ہوسکتی تھی' عمر کا فرق زیادہ نہ ہونے کے باوجود ماسی جوتلاں دھڑلے سے اسے چاچا کہتی آئی تھی اور اسی کی وجہ سے وہ پورے محلے کا چاچا اور پھر اپنی حرکتوں کی وجہ سے چاچا ٹیم پاس بن گیا۔

یہاں آنے کے بعد میرا اپنا ٹیم بھی چاچے کی وجہ سے اچھا پاس ہونے لگا۔ پہلے تو میں نے اس انتہائی کنڈے رہنے والے اول جلول سے اور ادھیڑ عمر شخص میں خاص دلچسپی محسوس نہ کی مگر پھر اس کے بارے میں مختلف لوگوں سے نے مختلف قصوں نے دلچسپی لینے پہ مجبور کردیا۔

میں جس گارمنٹ فیکٹری میں ملازم ہوا تھا' وہاں میری نائٹ ڈیوٹی تھی۔ شروع شروع میں طبیعت بیزار ہوئی' روٹین سیٹ ہوتے ہوتے وقت لگ گیا لیکن اب میں مزے میں تھا۔ شکر کرتا تھا کہ عام لوگوں کی طرح دن میں ڈیوٹی نہیں بھگتنا پڑی۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہوئی۔ سارا دن گدھوں کی طرح محنت کرو' رات ہوئی سو پڑو۔ دن رات نو بجے سے صبح پانچ بجے تک کام کرتا تھا۔ نائٹ شفٹ کے لیے تنخواہ بھی ڈے شفٹ کے مقابلے میں نسبتاً "زیادہ تھی۔ ماسی کا گھر زیادہ دور نہیں پڑتا تھا۔ واپس آکر منہ ہاتھ دھوکے' فیکٹری کے میلے کپڑے بدلنے اور ناشتہ کرنے کے بعد میں سات یا ساڑھے چھ بجے تک سو جاتا تھا۔ دن کی نیند جیسی بھری بھری نہیں ہوتی۔ تین چار انگڑائیاں لیتا اٹھ جاتا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کی روٹین نہیں رہی تھی۔ چائے کا کپ پی کے کچھ ماسی کے دکھڑے سنتا' کچھ ثمر پردیس سے پنجے لڑائی جاتی۔ اس کے بعد کا ٹائم پاس کرنے کے لیے چاچے ٹیم پاس سے اچھی صحبت کسی کی نہیں تھی۔ ایسے ایسے طولانی مگر دلچسپ قصے اس کے پاس تھے کہ کیا کہنے۔ سنا ہے بڑے بوڑھے ہزار بار کے سنائے قصے ہمیشہ بڑی رغبت سے دہراتے ہیں مگر چاچا کے پاس روز نئے سے نیا قصہ ہوتا اور میں یہ جانتے ہوئے بھی پوری دلچسپی اور مرعوبیت سے سنتا کہ یہ سوائے جھوٹ اور گپ بازی کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ بھئی جو ظلم ہم ٹکٹکی باندھ کے تین گھنٹے تک دیکھتے ہیں' وہ کیا ہی ہے..... نری گپ۔ پھر بھی ہماری محویت کم نہیں ہوتی اور چاچے کی جوانی کے قصے تو تھے بھی بڑے چٹ پٹے۔ ماسی نے دبے لفظوں میں کئی بار مجھے ٹوکا۔

"چاچے کے ساتھ زیادہ اٹھا بیٹھا نہ کر' اسے تو محلے اور برادری کا کوئی ہوش مند نہ نہیں لگتا' خراب کردے گا تجھے۔ میں تیری ماں کو کیا جواب دوں گی۔"

میں ہنس کے ٹال دیتا۔ میرا دل لگتا تھا وہاں۔ ویسے بھی میرا خیال تھا چاچے کو کسی نے ٹھیک طرح سے سمجھا نہیں۔ اس کے بارے میں مشہور افواہوں کی حقیقت بھی میں چاچے کے ٹوکل کر جان چکا تھا۔ رائی ضرور تھی مگر اس کا پہاڑ کھڑا کرنے محلے والوں کا کمال تھا۔

دو سرے تیسرے دن میں شام کو گھومنے بھی نکل جاتا' لاہور کی بتیاں اور گزیاں دیکھنے۔ وہیں سے گھومتے گھماتے ڈیوٹی پر۔ غرض میرا بھی وقت اچھا پاس ہو رہا تھا۔

ساڑھے تین ہزار روپے پہ ملازم ہوا تھا مگر تیسرے مہینے ہی جب نوکری پکی ہوئی تو تنخواہ بڑھ کے پونے پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔ اس کی خبر میں نے کسی کو نہیں دی۔ پہلے کی طرح گھر پہ دو ہزار ہی بھیجوا رہا ہوں۔ کیا کروں' ایک بیٹے کے بڑھ گراں کو کون بھج سکتا ہے۔ مجھے بھی اپنی ماں کی عادت کا پتہ ہے' دو چھوڑ دس ہزار بھی بھیجوں تو سارے کا سارا چولھے میں جھونک دیتا ہے۔ ایک تو یہ زبان کا پکا..... پتہ نہیں کون سی بھج دار مائیں ہوتی ہیں لوگوں کی جو آنہ آنہ خود بھی جوڑتی ہیں اور اولاد کو بھی سکھاتی ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کا پھر بنتے دیکھا ہے۔

میری اماں کا تو وہ حال ہے کہ چار پیسے ہاتھ میں آئے تو بھائیں قصائی کی دکان پہ۔ کلو گوشت تلوایا اور بھون کے کھالیا۔ حلوہ بنوایا اور پتے چھمکر کے کھالیا۔ نہ خود اچھے کپڑے پہننے کا شوق' نہ اولاد کو پہنانے کی چاہ۔ نہ اپنا زیور بنانے کی حرص جاگی' نہ دو جوان ہوتی بیٹیوں کے لیے بچا کے رکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ گھر کے لیے کوئی چیز لانا تو قطعی فضول سمجھتی تھیں۔ میں اپنے دونوں بڑے بھائیوں کا حشر دیکھ چکا تھا۔ پچھلے چھ سات سال سے ان کی محنت کی کمائی پہ پل بل کے ہمارے علاقے کے قصائی' پرچون والے اور

دودھ والے کے دن پھر گئے مگر ہمارا گھر وہی بھنڈار کا بھنڈار..... ٹوٹی چارپائیاں..... زنگ آلود ٹین کے ٹرنکوں میں پرانے کپڑے لتے ٹھونسے ہوئے۔ چند ایک بچکے ہوئے موڑھے۔ (بہن نے اپنے سلیقے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اخبار چڑھا رکھا تھا) ترمال پلتا مگر تام چینی کی ٹیڑھی میڑھی پیلی پلیٹوں میں ڈال کے کھایا جاتا۔

میں دو ہزار گھر بھیج کے بالکل مطمئن تھا۔ میرا ضمیر مجھے ماں اور بہنوں کے ساتھ اس بے ایمانی کے مظاہرے پہ ذرا بھی شرمندہ نہیں کرتا تھا' اس لیے کہ میں یہ رقم اپنے تللوں میں نہیں اڑاتا تھا۔

ماسی میرے ناشتے' کھانے اور چائے کا خیال رکھتی تھیں پھر بھی زیادہ تر میں ناشتہ ہی ان کے ہاں سے کیا کرتا تھا۔ دوپہر کو کھانے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ سہ پہر کو جہاں بیٹھا ہوتا' چائے تیم پاس کے ساتھ یا کسی اور دوست کے ساتھ۔ وہیں چائے کے ساتھ کچھ ہلکا پھلکا لے لیا۔ ایک آدھ بسکٹ یا سموسہ..... رات کو اگر گھر میں ہوتا تو جو دال روٹی وہ پکاتے' صبر شکر کے ساتھ کھالیتا۔ ویسے آپس کی بات ہے' کوثر پروین کے ہاتھ کی دال بھی کسی مرغ مسلم سے کم نہیں ہوتی۔ باہر آوارہ گردی کر رہا ہوتا تو نان چنے یا دس روپے والا برگر لے لیتا۔ یوں کھانے پینے پہ میرا خرچا نہ ہونے کے برابر تھا۔ پان سگریٹ کا شوق نہیں تھا۔ نوکری پہ جانے کا مخصوص لباس تھا۔ آدھا دن لنگی بنیان میں گزر جاتا۔ باہر جاتے ہوئے پہننے کے لیے پتلونیں شرٹیں لینی ہوں تو لنڈا بازار زندہ باد۔ لاہور کی سب سے اچھی چیز مجھے یہی لگی۔ یہ کام بھی مہینے میں ایک آدھ بار ڈیڑھ سو روپے میں ہو جاتا۔

یوں میں اپنے پاس موجود ستائیس سو میں سے خاصی رقم بچا لیتا تھا۔ جانتا تھا اپنے پاس جمع شدہ رقم کبھی بھی ایمان خراب کر سکتی ہے۔ خرچ کرنے پہ اکسا سکتی ہے' اس لیے میں نے دو جگہ کمیٹی ڈال رکھی تھی۔ دل میں ارادہ تھا کہ ایک کمیٹی نکلے گی تو موٹر سائیکل لوں گا اور دوسری والی سے بہن کے لیے کوئی چیز۔ کسی سگھڑ سیانی ماں کی طرح میں نے بہنوں کا جہیز بنانے کی ٹھان لی تھی۔ دونوں مجھ سے چھوٹی تھیں مگر اب شادی کی عمر کو پہنچ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"ہی ازبوائے..... چھتی پڑھو..... ہی ازبوائے....."

کوثر شام کو محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھایا کرتی تھی۔ میں اس وقت کم ہی گھر پہ ہوتا۔ آج کسل مندی سے صحن میں بچھی چارپائی پہ پڑا تھا۔ فوزیہ نے ابھی ابھی یہاں چھڑکاؤ کر کے پیڈسٹل فین چلایا تھا۔ نیچے بچھی دری پہ کوثر بڑی مدبّر سی بنی دوسری جماعت کی کسی کند ذہن بچی کو انگریزی کا سبق پڑھا رہی تھی۔ ایک تو اس کا انگریزی کا لہجہ ہی کم نہ تھا' اوپر سے ساتھ ساتھ کڑھائی کا شغل بھی جاری تھا۔ کسی ٹانکے میں الجھی وہ سخت بے زاری سے اسے یہ رٹا لگوا رہی تھی۔ مجھے سن سن کر ہنسی آ رہی تھی۔

"نالائقے..... ہی ازبوائے..... ہی ازبوائے۔"

اس کے تیل سے چپچپ کرتے سر پہ اس نے دو چار چپت لگا کے پھر یہ جملہ دہرایا۔

"اب بول مر..... ہی ازبوائے..... بوائے....." اس نے بوائے کو لمبا کھینچتے ہوئے کہا۔

"صحیح طرح بولی نہیں تو سوئی چبھو دوں گی ڈیلے میں۔" اس نے اپنی شاگرد کو دھمکانے کے بعد مجھے گھورا۔

"تمہیں بڑی ہنسی آ رہی ہے؟"

"ویسے تو تمہاری انگریزی سن کر رونا آ رہا ہے' کہتے ہیں مغرب کے وقت رونا مکروہ ہوتا ہے' اس لیے ہنس کر کام چلا رہا ہوں۔"

"مغرب کے وقت لیٹنا اور ٹانگیں ہلانا بھی اچھا نہیں ہوتا۔ یہ بات کسی سیانے نے نہیں بتائی۔ اوئے شبیر..... بیٹھ جا' ٹانگ توڑ دوں گی جو دوبارہ ہلا تو..... پورا صفحہ لکھ کے دکھا۔"

بات کرتے کرتے اس نے گھٹنے کے نیچے رکھا ڈنڈا نکال کے مڑیل سے شبیر کی سوکھی ٹانگ پہ مارا۔ وہ درد سے دہرا ہو گیا۔

"مکر نہ کر..... کام پورا کرا اپنا۔ مجھے اور بھی کام ہوتے ہیں۔ تیرے جیسے نالائق کے ساتھ ہی لگی رہوں۔ ایک تو قیس وقت پہ نہیں لاتے' اوپر سے دماغ کھا جاتے ہیں۔"

"اتنا تشدد اور وہ بھی ننھے معصوم بچوں پہ۔ ان کے لیے اتنا کافی ہے کہ یہ اس وقت تمہارے رحم و کرم پہ ہیں۔ ایک تو انہیں الٹا سیدھا پڑھا کے ان کا مستقبل خراب کر رہی ہو' اوپر سے یہ مار....."

"تم باہر کیوں نہیں جاتے' کیوں میری ٹیوشن خراب کر رہے ہو۔" وہ اپنے شاگردوں کے سامنے میری صاف گوئی پہ جھنجلا گئی۔

"ویسے جتنی محنت تم ان پہ کرتی ہو، اتنی خود کرلیتیں تو شاید میٹرک پاس کہلاتیں۔"

"میں نے میٹرک پاس کیا تھا۔" وہ ڈھٹائی سے زور دے کر بولی۔

میں مسکرا رہا تھا جیسے اس کے اس دعوے کی اصلیت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میری مسکراہٹ پہ اور بھی خجل ہو کے اس نے بلاوجہ اپنے ساتھ بیٹھی بچی کو موٹی سی گالی دے ماری۔

"بندر بندر کیا دیکھ رہی ہے؟ یہ سوال حل کر۔"

اس وقت وہ بھول گئی تھی کہ وہ قنتہ بچی ساجدہ باجی کی دخترِ نیک اختر تھی۔ اس نے شیر کی طرح سسکیاں روک کے چوٹ سہلانے کی بجائے گلا پھاڑ کے فریاد بلند کی۔ باجی ساجدہ کا سر فوراً "دیوار کے پار سے نمودار ہوا جیسے وہ اسی انتظار میں بیٹھی ہوں۔

"کوثر..... تمہارا ہاتھ بڑا کھلتا جارہا ہے۔ ذرا سی بچی کو بے دردی سے مارتی ہو۔ نہ بھئی..... میں نہیں پڑھاتی انہیں..... بہتیرے ملتے ہیں ٹیوشن پڑھانے والے۔ ان کے اسکول کی مس ترلے ڈالتی ہے۔ وہ تو میں سخلے داری کا لحاظ کرکے....."

یہ دھمکی بڑی کارگر رہتی تھی۔ یوں تو کوثر پروین کسی کی دھمکی کو جوتی پہ نہیں رکھتی تھی لیکن باجی ساجدہ کے ایک دو نہیں پورے پانچ کے پانچ بچے یہیں آتے تھے۔ چار تو اسکول جاتے تھے۔ پانچواں یو کی چھوٹی سی سلیٹ اور چاک اٹھا کے حرص میں آجاتا۔ اسے اگلے سال اسکول بھیجنے کا ارادہ تھا اور باجی کا خیال تھا' تب تک ٹیوشن میں آنے کی وجہ سے اسے دو گھڑی ٹِک کے بیٹھنے کی پریکٹس ہوگی۔ یہ محض ان کا خیال ہی تھا۔ وہ نہ خود ٹِک کے بیٹھتا' نہ کسی دوسرے کو بیٹھنے دیتا۔ کبھی اس کا قلم توڑ دیتا..... کبھی اس کی سیاہی گرا..... کبھی فلاں کا قاعدہ پھاڑ دیتا..... کبھی ڈھمکاں کے دانت کاٹ دیتا..... اور تو اور ہر دوسرے دن کیلا ہوگے گند بھی پھیلاتا۔ کوثر بیزار کرتی فرش صاف کرتی لیکن پھر بھی آنے سے منع نہیں کرتی۔ بغیر پڑھائے وہ اس کے پورے سو روپے وصول کرتی تھی۔ باقی چاروں کے دو دو سو روپے جبکہ دوسرے آنے والے بچے پچاس ساٹھ سے زیادہ نہیں دیتے تھے۔

"باجی' زور سے نہیں مارا..... یہ تو ایسے ہی گلا پھاڑنے لگتی ہے۔ ذرا دھیان نہیں دیتی پڑھائی پر۔ فیل ہو جائے گی تو آپ نے میری ہی گت بگڑنی ہے۔ میں ذرا اسے ڈرا رہی ہوں' مار اوار انہیں۔ تم لے لو جو ہاتھ بھی لگایا ہو۔"

اور واقعی وہ یہ قسم کھا بھی سکتی تھی' اس نے ہاتھ ہرگز نہیں لگایا تھا۔ آنکھوں جماعت کے عرفان کی حساب کی موٹی سی کتاب ہی تو ہاری تھی۔

بڑی مشکلوں سے باجی ساجدہ کے ماتھے کے بل دور ہوئے۔ وہ بری گھڑی کی طرح کسی نہ کسی طرح دیوار سے ٹیک تو گئی تھی لیکن نظروں سے ان کی ہونہار صاحبزادی کو گھورا اور دانت کچکچا کر گویا اسے پیس کر رکھ دینے کی خواہش پہ قابو پایا۔

میرے دل میں بہت سے نوکیلے فقرے مچل رہے تھے لیکن اس کی حالت دیکھ کر خود کو روکنا وہاں سے اٹھ گیا۔ ایسا میں نے اس پہ ترس کھاتے ہوئے نہیں کیا تھا بلکہ اپنے ہیجان میں کیا تھا کیونکہ میری کسی بھی اگلی اشتعال انگیز حرکت کے نتیجے میں وہ سارا غبار مجھ پہ نکال دیتی۔

"آخر کوثر کو ٹیوشن پڑھانے کی ضرورت کیا ہے۔"

میں نے ماسی سے پوچھا۔ ایسی عالم فاضل تو وہ نہیں تھیں کہ علم امڈا پڑ رہا ہو اور وہ لٹانے کو بے قرار ہو اور نہ گھر کے حالات ایسے ابتر تھے۔ جیسا ان کا طرزِ زندگی تھا' اس لحاظ سے آمدنی گزارے لائق سے زیادہ ہی تھی۔ یعنی جتنے پاؤں پھیلانے کے وہ عادی تھے' چادر اسی سائز کی تھی۔

"ضرورت کیا ہوتی ہے' ادھر کون سا روٹی کی تھوڑے۔ لڑکیوں بالیوں کے اپنے ارمان ہوتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کے اپنے کی کمائی سے انتاپچ جاتا ہے کہ میں بھی بستر' بھی کمبل' بھی استری' بھی برتن پانڈے لے کر پیٹی میں ڈال لیتی ہوں۔ تھوڑا بہت زیور میرا پڑا ہے' چار چار چوڑیاں ان کی بنالی ہیں پھر بھی آج کل چھتا ہو' اتنا لوگوں کو کم لگتا ہے۔ نوابوں کے گھر بھی دو تو اگلے جھوکے نگوں کی طرح آس لگائے ہوتے ہیں کہ بھوکل خانہ دھونے کے لیے برتن بھی ساتھ لے کر آئے۔"

میری ہنسی چھوٹ گئی۔

"ہنسنے والی نہیں' رونے والی بات ہے پترا میری ایک جاننے والی رفیعہ (غالباً "رفیعہ") نے ابھی پچھلے دنوں بچی بیاہی ہے۔ بیاہ کیا ہے..... بادرچی خانے کے سامان میں دیا سلائی تک رکھی تھی۔ نالے پانی (آرائش بند ڈالنے کی سلائی) بھی موجوڑوں پہ سجا رکھی تھی۔ لڑکے کو جو سامان دیا' اس میں طرح طرح کے جوڑوں' جوتیوں اور خوشبوؤں کے ساتھ میوہ ڈرائی منذنے والا بلیڈ بھی رکھا تھا جیسے اس سے پہلے تو اسے کبھی نصیب ہی نہیں ہوا ہوگا۔ یہ جہیز دیکھ کر میں نے تو پولے منہ سے رفیعہ کو کہہ دیا۔

"زلزلے میں تباہ ہونے والے خاندان کو لڑکی دے رہی ہو؟ جب ہی جہیز امدادی سامان کا شک ہوتا ہے۔" تو بس پتر حیدر بخشاں..... یہ حال ہے ہم سفید پوشوں کا کہ اب بچیاں بھی اپنے جہیز کے لیے خود ہاتھ پیر ماریں تو گزارا ہوتا ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ہمارے وقتوں میں ماسیں شادی کے لیے جب دو پے رنگواتے کے دو پٹرے میں سوکھنے ڈالتی تھیں تو ہم شرم کے مارے کمرے سے نہیں نکلتے تھے کہ باہر جہیز کی تیاری چل رہی ہے۔

ماسیں بچیوں سے بہانے بہانے سے ناپ لیتی تھیں کہ لحاظ رہے۔ شرم تو اب بھی ہے بچیوں میں مگر ضرورت..... بک بک..... یہ سب چاری ٹیوشنیں پڑھا کے جو ہزار روپیہ جمع کرلیتی ہے تو ہر مہینے ایک بڑھیا جو ڈابن کے ٹرنک میں چلا جاتا ہے۔ کبھی کوئی مسنگی' سستی کی چادر' کبھی تھرماس' کبھی شیشے کے گلاس' کبھی چھتی کے ڈونگے..... جتنے جوگی ہے' اپنا بندوبست کررہی ہے۔"

ماسی کی باتوں نے مجھ پہ ایک نیا در کھول دیا۔ میں نے جو اپنی بہنوں کے لیے شاندار نہ سہی' بھرم رچانے کے قابل جہیز بنانے کے جو ارادے باندھے تھے' وہ ایکدم پھس پھسے لگنے لگے۔ اگر یہی زمانے کا چلن ہے تو میں کب تک اس قابل ہو پاؤں گا کہ..... میرا دل بجھ کے رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

"لے..... ہور سن' یہ تیرے چاچے ٹیم پاس نے کیا چن چاڑھا ہے۔"

میں نیند سے زیادہ تھکن سے نڈھال تھا۔ یہ تھکن جسمانی نہیں' اعصابی اور ذہنی تھی جو کل ماسی کی باتیں سن کر مجھ پہ حملہ آور ہوئی تھیں۔ ساری رات میں وھیان سے کام نہ کرسکا تھا' اب ماسی کی باتوں پہ دھیان کیا دیتا۔

"میرے سر میں سخت درد ہے ماسی!" اس وقت مجھے دن میں تارے نظر آرہے ہیں۔ چاچے کا چن پھر بھی دیکھ لیں گے۔"

میں نے ناشتے کو نظر انداز کرتے ہوئے چائے کا مگ لبوں سے لگایا اور گرم گرم شیرہ نما چائے حلق سے اترتے ہی اپنا سر تکیے پہ رکھا اور کھیس منہ تک تان لیا۔ ماسی دل میں اپنی خیر لے سامنے چوکی پہ بیٹھی رہ گئیں اور یہ غلط نہ تھا۔ کئی گھنٹوں کی نیند لے کر جب میں جاگا تو انہیں اسی چوکی پہ اسی انداز میں بیٹھے دیکھا۔ پہلے تو مجھے لگا کہ جیسے میری آنکھ گھڑی بھر کو لگی ہوگی لیکن وقت دیکھا تو سوا گیارہ ہو رہے تھے۔

"ارے ماسی! آپ اب تک یہیں بیٹھی ہیں؟"

"تیرا سر کا درد کیسا ہے؟ لگتا ہے آرام آگیا۔ لے پھر سن' یہ جو چاچا ہے نا' جس کی تو بڑی حمایتیں کرتا ہے' اس نے وہ کیا ہے جو ہماری برادری میں بھی کسی نے نہیں کیا۔ جس کو پتہ ہے کہ یہ ہمارے شریکوں میں سے ہے' وہ سارے میری سات پیڑھیوں کو ٹھوک رہے ہیں' شرم آرہی ہے مجھے یہ سوچ کر کہ یہ میرے باپ کا شریک بھائی لگتا ہے۔ تو بے..... تو بے....."

"کیا چچا نکاح کھڑکا لیا چاچے نے؟" میں نے لمبی سے جمائی لینے کے بعد پوچھا۔

"وہی کرلیتا تو اچھا تھا۔ چلو وہ تو شرعی حکم ہے' اس میں کیا عیب۔ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے بڈھی عمر میں دو ٹبی لانے پہ لعن طعن کرتے لیکن یہ جو اس نے کیا ہے' ہائے میں مرجاواں۔"

وہ دونوں ہتھیلیاں رگڑ رگڑ کے افسوس کررہی تھیں۔

"کرائے دار آگئے ہیں اس کے۔" انہوں نے اطلاع دی۔

"وہی تین چار سنگھار میزوں اور شیشوں کے پرانوں والے؟" مجھے دو دن پہلے کی ان کی بات یاد آئی۔

"کیا ہوا' کیا ٹھیک عورتیں نہیں ہیں؟" میں نے زاداری سے پوچھا۔

"عورتیں ہی نہیں ہیں۔" جواب بھی اسی زاداری سے ملا۔

"کیا مطلب' کہاں گئیں؟"

"کھوہ (کنویں) میں۔" ماسی نے جل کر کہا۔

"چاچے نیم پاس نے خسرے (بچڑے) کرائے دار رکھ لیے ہیں۔" وہ رونے والی ہو گئیں۔ خیر جرات انگیز ضرور تھی مگر دردناک نہیں' اس لیے ان کی رقت سمجھ سے باہر تھی۔ میرا دل تو قہقہے لگانے کو چاہ رہا تھا۔

"اس محلے میں پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اب ادھر طبلے کھڑکیں گے' تالیاں پیٹی جائیں گی' چھمکے لگیں گے۔"

"وہ تو پہلے بھی اکثر لگتے ہی رہتے ہیں' ہر خوشی کے موقع پہ سگے رشتے داروں سے پہلے یہی خدائی فوجدار پہنچے ہوتے ہیں۔"

"وہ اور بات ہے لیکن اب شریف لوگوں کے برابر تن کے رہیں گے یہ۔ دھیوں' بہنوں والے گھروں کے سامنے بسیں گے اور ایسا صرف چاچے نیم پاس کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ وہ آپ شغلیے اور روتی ہے۔ اپنا دل بہلانے کو یہ میراثی خانہ گھر میں گھسا لیا ہے۔ ہائے ہائے... میری تو دیوار سے دیوار ملی ہے۔"

"تو وہ کون سا دیوار پھلانگ کے ادھر آجائیں گے۔" میں نے ان کی فکرمندی کم کرنا چاہی۔

"بڑا اثر پڑتا ہے ہمسایوں کا۔ بس ہم سارے محلے داروں نے اکٹھا کرایا ہے کہ نہ صرف چاچے کو یہ نیا کرائے دار بلکہ چاچے کو بھی یہاں سے نکال باہر کرنا ہے۔"

"یہ آپ نہیں کرسکتے' اس لیے کہ وہ اپنے ذاتی مکان میں بیٹھا ہے اور قانون کی رو سے اپنا مکان کسی کو بھی کرائے پہ دے سکتا ہے۔ ہاں اگر یہ نئے کرائے دار کسی غیر قانونی کام میں ملوث ہوتے تو یہ قدم اٹھایا جاسکتا تھا لیکن جہاں تک میرا خیال ہے' قانون میں اب تک شادی بیاہ پہ "ویلیں" لوٹنے والوں پہ کوئی حد نہیں ہے۔"

"رحم دور... چولہے میں جائے قانون۔ یہ ہمارا محلہ ہے' ہماری مرضی کہ ہم کسے رکھیں اور کسے نکالیں۔ بھلا شریف لوگوں کے محلے میں خسروں کا کیا کام۔"

"کہیں تو رہنا ہی ہے غریبوں نے۔" کوثر نے برتن مانجھتے مانجھتے دخل دیا۔

"اس محلے میں نہ سہی تو کسی اور محلے میں۔ اگر سب لوگ انہیں نکالتے رہے تو وہ جائیں گے کہاں' ان کے لیے الگ محلہ یا شہر تو بسنے سے رہا۔"

"تو چپ کر' ڈوی آئی ہمدرد بن جاتے کی۔" ماسی نے اسے جھڑک کے رکھ دیا۔

"بھلا حنیف کہتا ہے۔ کل سویرے سے پہلاں پہلاں وہ خسروں کی ڈولی ادھر سے اٹھوا کے رہے گا۔"

"ہاں اس جیسا راشی دھڑلے سے یہاں رہ سکتا ہے اور ہر آتے جاتے نے گردن اکڑا کے سلام بھی وصول کرسکتا ہے۔ ماسی کا اپنا بیٹا سلمان خان رہ سکتا ہے۔ جس نے اس محلے کی کسی کو ڈھیلی لڑکی کو بھی چھیڑنے سے نہیں بخشا۔

یہاں بنیا نیا آیا تھا اور چاچے کے مکان میں ایک بیوہ خاتون اپنی بہت ہی بیوہ بیٹی کے ساتھ کرائے پہ رہتی تھی۔ ان دنوں چاچا دو سرے تیسرے دن منہ بھی دھوتا تھا۔ ہفتے میں ایک بار نالے پہ بیٹھے نائی کے آگے اکڑیں بیٹھ کے استرے سے شیو بھی بنواتا تھا۔ بنیان کے اوپر کرتا بھی پہنتا تھا اور تہمد بھی شوخ رنگوں والے ہوتے تھے مگر یہ بیوہ کرایہ دار نیاں زیادہ دن ٹک نہ سکیں اور چاچے کو اپنی جون میں آنا ہی پڑا۔

"بڑی دیر سے پہنچے ہے تیرے تک خبر۔" چاچے نے اپنے آدھے کھنچے سر پہ خارش کرتے ہوئے طلحا" پوچھا۔

"جتوالاں اتنی آلکسی تو کبھی نہیں رہی خبریں پھیلانے میں۔"

"نہیں' ماسی کی سوں تو یہی کو ٹیک ہے۔ میں ہی ذرا دیر سے ہاتھ گرا اور سناؤ چاچا' کیا خبریں ہیں؟"

میں نے قدم قدم رکھتے ہوئے تجسس انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔

صحن میں لگی الگنی پہ درجنوں رنگ برنگے کپڑے لہرا رہے تھے۔ برآمدے کے اس کونے میں اونچی ہیل والی سینڈل کا ڈھیر لگا تھا۔ اندر کسی کمرے میں لگے ٹیپ ریکارڈر پہ نور جہاں کی شوخ آواز بجھر رہی تھی۔

کیا زبردست ماحول تھا..... کیسا افسانوی اور رومانوی سا..... کاش یہ انہی مناظر تک محدود رہتا مگر اس سارے تاثر کا بیڑہ غرق کرنے کے لیے اندر سے کوئی کھنکھناتی چلتا باہر آیا۔ سبز گھیر دار ہوتی شلوار..... پرنسٹ بڑے سے گلے والی فٹنگ کی قمیص..... اونچا لمبا قد' گہرا سانولا رنگ مگر صرف گردن کی حد تک۔ گردن سے اوپر چہرہ کالا سبزی مائل سفید۔ مصنوعی کرز لہریں سجا کے جوڑا بنایا گیا تھا۔ ہاتھ میں کٹورا اٹھا رکھا تھا۔

"چاچا! مہندی لگائی ہے' بڑی رانگلی (رنگ والی) ہے۔" اس نے چاچا' نہیں پاس کو آنکھ کی اور چاچا کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ میری وجہ سے شرما رہا ہو۔

"اوہو' پروہنے آئے ہیں۔ اپنے پروھنے سے ہی کہو دیدار کے ہاتھوں سے اپنے پیروں پہ مہندی لگوالے' ٹھنڈ پڑجائے گی۔"

"پیروں پہ ہی کیوں؟" میں نے بے تکلف ہونا چاہا۔

"ماکہ اور دو گھنٹوں تک اوھر سے اٹھنے کے قابل نہ رہو۔" دیدار نے بلند قہقہہ لگایا اور مٹکتی ہوئی دوسرے کمرے میں گھس گئی۔

"اچھی رونق لگالی ہے چاچا!"

"او بس..... رونق کیا لگانی۔" وہ بغلیں جھانکنے لگا۔

اتنے میں دروازہ ایک بار پھر زور سے بجنے لگا۔

"یہ کون بے ہنگم۔" وہ اپنی بوسیدہ چپل گھسیٹتے ہوئے اٹھا۔ میں آرام سے بیٹھا غرغوش کو مٹی کھودتے دیکھتا رہا کیونکہ میں جانتا تھا' آنے والے کون ہوسکتے ہیں۔

"کیوں بھئی چاچا! یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے؟"

اس گروہ کی لیڈری کررہے تھے ہمارا حنیف' لہٰذا سب سے پہلا سوال انہوں نے ہی اٹھایا۔

"تماشا تو تمنی سارے لگا رہے ہو میرے دروازے کے آگے کھڑے ہو کر۔ نہ یہ کوئی سنیما ہے جس کے ٹکٹ مفت میں بٹ رہے ہیں جو تم سارے کے سارے بغیر ٹین بنائے جمع ہوجاؤ۔ چلو جاؤ گام کرو اپنا۔"

چاچے نے رکھائی سے جواب دے کر دروازہ بند کرنا چاہا مگر لوگوں نے دندناتے ہوئے آگے گھس کر یہ کوشش ناکام بنادی۔

"چاچا کس کی اجازت سے تم نے محلے میں خسروں کی ٹیم گھسائی ہے۔"

"ابھا..... مجھے نہیں پتہ تھا کہ اس کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔" چاچے نے بھولپن سے منہ لٹکا کے کہا اور ایسا کرتے ہوئے اس کی صورت پہلے سے کہیں زیادہ مکار محسوس ہوئی۔

"اس سے پہلے تو بغیر اجازت کے ہی انہیں آتے دیکھا ہے۔"

"بات کو گھماؤ نہیں چاچا!! انہیں ابھی' اسی وقت نکال باہر کرو۔ ہم ایک منٹ بھی انہیں یہاں برداشت نہیں کریں گے۔ یہ اس محلے میں بالکل نہیں ٹھہر سکتے۔"

"اچھا..... چاچے نے اثبات میں سر ہلایا۔

"پہلے یہ ثابت کرو کہ تم انہیں ایک منٹ بھی برداشت نہیں کرسکتے۔"

"کیا مطلب؟" افضل بٹ چونکا۔ یہ دعوا اسی نے کیا تھا۔

"مطلب امہ کا کاکا' ابھی پچھلے دنوں تمہارے ہی گھر میں اکٹھے ہوئے تھے اور مجھے نہیں یاد پڑتا کہ تم نے کسی کی اجازت لی تھی۔ تم سب کا اپنا گزارا انہیں دو تان کے بغیر۔ ہر روز کسی نہ کسی کے گھر کے آگے ناچ رہے ہوتے ہیں۔

لال دین قصائی رہ سکتا ہے جو مردہ مرغیاں اور باسی گوشت نزدیکی ہوٹلوں میں فروخت کردیتا ہے۔ عیسٰی خان رہ سکتا ہے جو اول درجے کا سود خور ہے۔ ڈاکٹر ارس پن رہ سکتا ہے جو ہے تو کسی سرکاری خیراتی ہسپتال کا معمولی کمپاؤنڈر مگر دھڑلے سے خود کو ڈاکٹر کہلواتے ہوئے کلینک کھول کر بیٹھا ہے اور جس کی ٹیبل پہ ایک ٹرے میں پہلے سے تیار شدہ پڑیاں رکھی ہوتی ہیں۔ ہر پڑی میں ایک ایک پین کلر' ایک خنیق کی گولی' ایک نزلے زکام اور ایک بخار کی گولی اور ایک گلے خراب کا سیرپ ہوتا رکھا ہوتا ہے۔ سب مریضوں کے منہ میں ایک ہی تھرما میٹر ٹھونسنے کے بعد وہ سب کو مساوات کی بنیاد پہ یہی پڑیاں تقسیم کرتا ہے۔ کوئی زیادہ حجت کرے تو گلوکوز کا انجکشن اسی سرنج سے گھونپ دیتا ہے جو چاروں سے مختلف بازوؤں میں چبھوئی جاچکی ہے۔ یہ موت کا سوداگر اور بیماروں کا بیوپاری یہاں رہ کے مسیحا کہلا سکتا ہے' صرف یہ بیچرے نہیں رہ سکتے۔"

میں نے یہ سب صرف سوچا' کہنے کا فائدہ کوئی نہیں تھا۔ صورت حال کا اصل جائزہ لینے کے لیے میں چاچا کے گھر جا پہنچا۔

خلاف معمول آج چاچے کی چارپائی دروازے کے آگے نہیں بچھی تھی' نہ ایک کواڑ کھلا تھا۔ پہلی بار مجھے دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔

"ہاں بھئی....."

"چاچا..... گھر ہی ہو؟"

"نہیں' گھر سے نکلا ہوا ہوں۔" اکتائے لہجے میں جواب ملا اور اگلے ہی لمحے دروازہ کھول کے چاچا میرے سامنے تھا۔

وہی پرانی پتلی چھلکا سی ہوئی بنیان جس کا رنگ کبھی سفید ہو ماہو گا' اب تو نیلا سا سرمئی سے اور جس میں ان گنت چھید تھے۔ وہی ڈبوں والا تہمد جس میں سے بدبودار سخت زور آور قسم کے پسینے کے بھبکے اٹھتے تھے اور جس پہ ہر ہر جگہ کے نشانات موجود تھے۔ چائے' تیل اور پان سے لے کر مرغیوں کی غلاظت تک کے۔ وہی ہفتوں سے بے دھلا منہ..... وہی پیلے دانت اور جاسنی مسوڑے..... وہی مرزل ہی شکل پہ خار کی طرح اگے سخت اور کھردرے سفید بال' نوچ صاف ہوتے تھے نہ تاڑھی بڑھتی تھی۔ وہی ناخنوں میں بھری میل اور وہی پھٹی ایڑیاں۔

چاچا کو ہر ہفتے میں' میں نے تب دیکھا تھا' جب میں

کبھی کسی کا کا' کا کاکی ہونے پہ..... کسی کے عقیقہ یا سرمنڈنے پہ..... شادی ویاہ یا منگنی پہ..... کبھی بچہ پاس ہونے پہ..... تم لوگوں کا تو بس نہیں چلتا مرگ والے گھر پہ بھی دریاں بچھا کے ان کے مجرے کرالو پھر اب اتنا خار کیوں کھا رہے ہو۔"

"وہ الگ بات ہے چاچا! خوشی کے موقعہ پہ بندہ رنگ لگا ہی لیتا ہے' کوئی موج میلہ کرنے کے واسطے لیکن ان کو گوانڈی بنا کے سر پہ سوار نہیں کرسکتے۔ ادھر کا ماحول خراب ہوگا۔"

"او چل چل..... کم کرانیا۔ وڈا آیا ماحول سنوارنے والا۔ پہلے اپنے گھر کا ماحول تو ٹھیک کر۔ میری بچی چوبیس گھنٹے دروازے کے آگے پڑی رہتی ہے۔ محلے کے کس گھر میں کیا ہو رہا ہے' سارا پتہ چلتا رہتا ہے مجھے۔"

افضل بٹ اس بلیک میلنگ کے زیر اثر آگیا اور دوبارہ منہ کھولنے سے باز رہا۔

"واہ جی واہ..... ساری عمر ہم لوگ دوسروں کے گھر میلے لگاتے رہے' آج ہمارے گھر میلہ لگا ہے۔"

اندر سے کوئی اپنی مخصوص لچک مٹک کے ساتھ برآمد ہوا اور لپ اسٹک سے تھپے موٹے ہونٹوں پہ مہندی بھرا ہاتھ رکھ کے ٹھٹھا لگایا۔

"نی بلو..... باہر نکل..... وڈے وڈے لوگ آئے ہیں بلو سے ملنے..... بھئی لین بناؤ سارے..... جنے جنے جانا اے بلو دے گھر' کنے کنے جانا اے بلو دے گھر۔"

بغیر کسی الٹی میٹم کے وہ ناچنا اور ٹھمکے لگانا شروع ہوگیا۔ گود میں ڈھولکی اٹھائے پچھلے کمرے سے رانی مکرجی بھی برآمد ہوئی۔ یہ ایک پستہ قامت گول مول سا ہیجڑا تھا جس نے آنکھوں میں نیلے لینس بھی لگا رکھے تھے۔ اس کے پیچھے پیچھے اونچے دانتوں والی گہرے کالے رنگ کی لمبی تڑنگی ملکہ تھی۔

تینوں نے مل کے رونق لگادی۔

انہیں نکلوانے کے لیے مظاہرہ کرنے آئے بھاحنیف کے وفد کے ارکان جیب سے دس اور بیس کے نوٹ نکال نکال کر نچھاور کرنے لگے۔ اچھی طرح جیبیں جھاڑ کے جب وہ یہاں سے رخصت ہوئے تو یقیناً یہ بات فراموش کرچکے تھے کہ ان کے یہاں آنے کا مقصد کیا تھا۔

"لے بھئی چاچا' تیرا کرایہ تو پہلے دن ہی اکٹھا ہوگیا۔" ان کے گرو نے نوٹ گنتے ہوئے قہقہہ لگا کر کہا۔ وہ سب سے چھوٹے والے سے اپنے شانے دبوا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

بعد میں ماسی نے مجھے بڑی لے دے کی کہ جب محلے کے شرفاء چھاپہ مارنے چاچے کے گھر گئے تھے تو میں وہاں سے برآمد ہوا تھا۔

"تو میرا رشتے دار ہے' میرا پروہنا ہے۔ بدنامی تو میری ہی ہوئی۔" انہوں نے طعنہ دیا لیکن جب میری زبانی آگے کی روئیداد سنی تو چپل پاؤں میں اڑس کے محلے کی عورتوں تک ان کے شوہروں کا یہ نیا کارنامہ پہنچانے چلی گئیں۔

لگ رہا تھا اس بار چاچے کے کرائے دار ٹک جائیں گے کیونکہ ان کے کافی قدردان اُگ آئے تھے۔ جبکہ پچھلے کرایہ داروں کے پسپا ہو کر بھاگ جانے کی وجہ یہی تھی کہ اکیلا چاچا ہی ان کے نخرے اٹھانے والا تھا جیسا کہ پچھلی بار بھاگنے والی وہ بیوہ خاتون اور ان کی بہت ہی بیوہ صاحبزادی۔ صاحبزادی "بہت ہی" اس لیے تھیں کہ دوبار بیوہ ہوچکی' تیسری بار چاچا مرگیا (اس کے کاجل بھرے نینوں پہ) لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ چاچے پہ بہت ہی زیادہ بیوہ صاحبزادی کی بجائے نسبتاً" کم بیوہ ماں مائل بہ التفات نظر آتی تھی اور چاچے کا وہ حال کہ ادھر جاؤں یا ادھر۔ تب میں نیا نیا یہاں آیا تھا' اس سے اتنی بے تکلفی نہیں بڑھی تھی کہ کوئی مشورہ دیتا' ورنہ کسی پار تو نیا لگا ہی دیتا۔ محلے والوں کو دو جوان جہان بیواؤں کا چاچے کے ساتھ اکیلے رہنا کھٹکتا تھا' اس لیے آئے دن پنچایتیں بیٹھتیں۔ ماں چاچے پہ دباؤ ڈالتی کہ دنیا والوں کی زبان بند کرنے کے لیے وہ کوئی قدم اٹھائے' کوئی شرعی قدم جبکہ چاچا اس کی بیٹی کی آس پہ تھا۔ اتنے میں ماں بیٹی کو کوئی اور لے اڑا۔ وہ مکان خالی کرگئیں اور چاچے کا دل بھی۔

اس سے پہلے کا احوال میں کافی لوگوں سے سن چکا ہوں۔ ان بیوہ کرائے دارنیوں سے پہلے کی کرایہ دارنیاں کنواری تھیں۔ (ماں کو چھوڑ کے) ان تین عمر رسیدہ کنواریوں میں سے انتخاب کرنا بھی چاچے کے لیے کافی مشکل ثابت ہوا۔ وہ اسی ادھیڑبن میں کئی مہینے تک لگا رہا' یہاں تک کہ تینوں ڈھلتی عمر کی کنواریوں نے ادھر ادھر ہاتھ پیر مار کے اپنے اپنے بر تلاش کرلیے۔ یہ گھر ان کے لیے خاصا بھاگوان ثابت ہوا تھا جو کام تیس سالوں میں نہ ہوسکا' وہ چھ مہینے میں ہوگیا۔ ادھر ان کی ماں نے بیٹیوں کی منگنی

کے لڈو چاچا کو بھجوائے' ادھر چاچا نے انہیں مکان خالی کرنے کا نوٹس بھجوا دیا۔ اس نے اپنی تین عدد بیویوں کو زیادہ عرصہ ٹکنے نہ دیا تھا۔ یہاں تو سسی اور کی ہونے والی بیوی کو کیسے رکھ لیتا' چاچے کرائے پہ ہی.....

"تیرے نام.....ہم نے کیا ہے....."

سلمان نے چھت پہ سے ہانک لگائی تھی اور چونکہ عین سیڑھیوں کے درمیان ہاسی' فوزیہ کو گھٹنوں میں دوپٹے اس کی آنکھیں نکال رہی تھیں' اس لیے ان تک یہ صدا با آسانی پہنچ گئی۔

"آگے بڑے محل حویلے کھڑے ہیں پیو دادا کے جو تو پتہ نہیں کس کے نام لگانے چلا ہے۔ چل نیچے اترب جیا....." پہلے ہی رنگ ماٹھا تھا اب غصے سے مکھے پہ کھوب کھلا کے پکا کرلیا ہے۔ سارے سوسو باتیں کرتے ہیں کہ تیرے منڈے کو "جیجا" (قیس) بھی نصیب نہیں ہوتا۔ موٹی پتلون ہے تو وہ سوکھی سڑی ٹانگوں پہ کھال کی طرح چڑھی ہوئی۔ تو تو کہیں اٹھتا بیٹھتا ہے تو میری جان اٹک جاتی ہے کہ لوہی اب پتلون کی سلائی نکلی کہ نکلی..... مگر تو ایسا شرم بیچو ہے کہ ذرا خیال نہیں۔ بعد میں اس "وندلو" (بڑے دانت والی) کے نام لگاتے رہنا' نوچ لگانا ہے' پہلے نیچے اتر کر گلے میں کچھ ڈال۔"

سلمان برے برے منہ بناتا نیچے اترا۔ اتوار کا دن تھا اور میں خاصا فریش اور فارغ فارغ بلکا پھلکا سا محسوس کر رہا تھا خود کو کیونکہ اتوار کی رات کو میری ڈیوٹی آف ہوتی ہے۔

"لاؤ کیا ہے..... کیا کھانا ہے؟"

"میرا سر..... کھانے پینے کے وقت ہی ماں کے متھے لگنا ہو تا ہے۔"

"خودہی تو بلایا تھا کہ نیچے آکر گلے میں کچھ ڈال لو' ورنہ مجھے خاص بھوک نہیں۔"

"میں نے گلے کے اندر نہیں' گلے کے اوپر کچھ ڈالنے کو کہا ہے بے شرما۔ بہنوں کے سامنے ننگا بوچا پھرتا رہتا ہے۔ یہ حیور بخت کو دیکھ' کیسا شریاں والا بچہ ہے۔ پورے بازوؤں کی قمیص پہنتا ہے....."

ابھی میں تعریف پہ خاص اترا ہی نہ سکا تھا کہ سلمان نے طنزیہ وار کیا۔

"میرے ایسے بھنڈی توری بازو ہوتے تو میں بھی ایک نہیں دو دو قمیصوں میں چھپا کے رکھتا لیکن یہ دیکھو اماں....." اس نے اپنے مسلز پچکاتے ہوئے تخریہ کیا۔

"یہ میرے ڈولے دیکھو..... کہ لایعہ کسی قمیص میں پورے آتے ہیں۔"

"چل چل.....یہ ڈولے' اس کو کھایا کر جس کے لیے تو اوپر چڑھتا ہے۔"

انہوں نے سامنے والے گھر کی بشریٰ کا ذکر کیا جس کا مزاج بھلے سوا نیزے پہ رہتا تھا مگر تمام تر چڑچڑے پن اور بدمزاجی کے باوجود جس کے دانت ہر وقت نکلے رہتے تھے کیونکہ وہ اندر جاتی نہیں سکتے تھے۔

"اس سے پہلے کہ سلمان اپنے دفاع میں یا اس کی زندلو کی حمایت میں کچھ اور کہتا' دروازہ دھڑ دھڑ بجنا شروع ہو گیا۔

"میں دیکھتی ہوں۔" فوزیہ کے لیے اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا ماں کے نرغے سے نکلنے کا۔ وہ ایسے ہی بال بکھرائے بغیر دوپٹے اور چپل کے باہر بھاگی۔

"ذی فوزیہ..... گلے میں تو کچھ ڈال..... ہوسے باہر کون ہو۔" اس بار انہوں نے اس کے گلے میں کچھ ڈالنے کی فکر کی لیکن باہر اور کوئی نہیں میری بلی تھی۔

"بے بے....." حیرت اور خوشی نے بیک وقت مجھ پہ حملہ کیا۔ مجھے پورے دو مہینے ہو رہے تھے گھر گئے ہوئے۔ شروع میں' میں ہر ہفتے گھر بھاگتا تھا' پھٹی وہیں گزارتا پھر ایک ہفتہ چھوڑ کے۔ بعد میں دو دو ہفتے گزار کے جانے لگا۔ ایسا نہیں تھا کہ گھر والوں کی یاد نہیں آتی تھی لیکن کام کی تھکن اتارنے کی بجائے سفر کی مزید تکان خود پر سوار کرنے سے گھبرانے لگا تھا میں۔ اگلی شام کام پہ جانے سے بجائے تازہ دم ہونے کے' میں نڈھال ہوتا تھا اور دوسرا سفر کے خرچے سے بھی گھبرا گیا تھا۔ سستے سفر میں اگر چیکنگ جاتے اور کوچ سے آنے جانے کے کئی سو لگ جاتے۔ وہاں جا کر بے بے بجا بھی بھی جھاڑ لیتی' بے بے کو شاید میری یاد زیادہ ہی ستانے لگی تھی' اسی لیے وہ بغیر اطلاع کے یہاں موجود تھیں۔

میں دوڑ کے ان سے لپٹ گیا۔

"بے بے....." بتایا تو ہو نا اپنے آنے کا۔ میں اڈے تک لینے آجاتا۔ گھر تو آرام سے مل گیا تھا؟ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"ساہ تو لینے دے پتر' ہف گئی ہوں میں..... تو نے اتنا لمبا پینڈا....." انہوں نے برقعے کے بٹن ایک جھٹکے سے کھولتے ہوئے اسے اتار کر نزدیکی چارپائی پہ پھینکا اور ماسی کی جانب

متوجہ ہوئیں جو دونوں بازو پھیلائے اپنا بھاری بھرکم ڈیل ڈول سنبھالتیں خیر مقدمی انداز میں آگے بڑھ رہی تھیں۔ فوزیہ نے جان بخشی ہوتے دیکھ کر اپنے کھلے بال فٹافٹ لپیٹنا شروع کر دیے تھے۔ کوشش بھی متجسس انداز میں صحن میں جھانک رہی تھی۔

"ت تسم اللہ.....جی آیاں نوں..... میری بہن آئی ہے' جاؤ سلمانا..... بھاگ کے اپنے پیو کی دکان سے ٹھنڈی رول پکڑ کے لا۔ ساتھ اسے بتا کے آگے ڈونگہ بونگہ ہے ان ریماں آئی ہے۔"

"ریما؟" اپنے مسلز کو ستائش سے سہلاتا ہوا سلمان ایک دم چونکا گیا۔

"واہ خالہ..... آئی تو ڈونگے بونگے سے ہو' پر نام بونگا نہیں ہے..... ریما..... واہ..... کس نے رکھا تھا یہ ماؤرن نام؟"

"میری بے بے کا نام ریما تھیں' رحیمہ ہے۔" میں قاعدہ یاد آگیا' اس لیے وضاحت پیش کی کیونکہ بے بے کسی بھی قسم کی وضاحت پیش کرنے کی بجائے پورا منہ کھولے اس کو تک رہی تھیں۔

"با..... بائے..... بتولاں..... ایہ کی اے.....؟"

"میرا پتر سلمان۔" ماسی نے شرمندہ شرمندہ سا اعتراف کیا۔

"اچھا اچھا' اکھاڑے جا رہا ہو گا؟" بے بے نے اس کا ڈیل ڈول دیکھ کے اندازہ لگایا۔ "رنگل کاشوق ہے منڈے کو..... اچھی بات ہے۔"

"رنگل رنگل نہیں خالہ' باڈی شاڈی بنانے کا شوق ہے اور میں کسی اکھاڑے میں نہیں جم جاتا ہوں۔"

"پہلے وہاں جاتیاں میں نے کہا ہے۔" ماسی نے گھور کے اسے بھگایا۔ انہیں ہر وقت یہ ڈر رہتا تھا کہ دوسرے سلمان کے حوالے سے ان کا مذاق نہ اڑائیں۔

کوثر پروین سلام کرنے آئی تو ماسی نے تعارف کا مرحلہ بھی نمٹایا۔

"یہ میری وڈی بے' کوثر ہے..... تو نے جب دیکھا تھا یہ ہوئی تھی بھی۔"

"نہیں خیر اتنی چھوٹی تو نہیں تھی۔ مجھے تو اب بھی ویسی ہی لگ رہی ہے۔" بے بے نے خاص رغبت سے اسے نہ دیکھا۔ ویسے بھی وہ ایسی چیز نہ تھی۔ یاد ہے تو بس چار موٹے موٹے بل لیے بارے باندھے کھڑی تھی۔

"اور یہ نکی' فوزیہ..... اپنے پیو کی لاڈو' فوجیہ رانی۔"

"یہ تو بالکل دوسری بتولاں ہے۔" انہوں نے صورت دیکھ کے ہی رائے قائم کر لی۔ حالانکہ فوزیہ سیرت میں بھی ماں کا پرتو تھی۔

کوثر کے ماتھے پہ بے شک بل پڑے رہیں۔ بھلے وہ روکھے انداز میں مہمانوں کو سلام کرتی ہو۔ چاہے حال چال تک پوچھنے کی توفیق نہ ہوتی ہو لیکن ایک بات تھی اور وہ یہ کہ وہ مہمانوں کی خاطر مدارت بھی بہت کرتی تھی۔ کھانے کا وقت ہو جانے میں خاص وقت نہ تھا۔ ماسی نے پالک کا ڈھیر میرے سامنے کاٹ کر دیا تھا اسے' اس لیے بے بے کی آمد سے قبل شاید صرف وہی پکنے کا پروگرام تھا مگر جب کھانا لگا تو پالک گوشت کے علاوہ ماش کی دال اور آلو قیمہ بھی دسترخوان پہ موجود تھا۔ بے بے تھہرس کمال کی گوشت خور ہیں۔ انہوں نے پلیٹ کے کھانا کھایا مگر حسب عادت ایک لقمہ بنانے والی کی تعریف میں نہیں کہا۔

میں ان سے گھر کی' وڈے بھاجی کی' اپنی تینوں بہنوں کی باتیں کرنے کے لیے بے تاب تھا مگر وہ کھانے کے وہیں ماسی کے ساتھ ان کی چارپائی پہ لیٹ گئیں اور لگیں برادری بھر کے بخیے ادھیڑنے۔ کبھی کسی کا خیال آجاتا' کبھی کسی کا دھیان۔ کبھی ماسی کو ڈونگہ بونگہ کی اپنی کسی سہیلی کی یاد آجاتی اور وہ اس کا احوال دریافت کرنے لگتیں۔

"ہائے..... مشتری کی ساس ابھی تک زندہ ہے؟" وہ جی بھر کے حیران ہوئیں۔

"حیرت والی بات تو یہ ہے کہ ایسی ساس کے اتنے سالوں سے ساتھ ہوتے ہوئے وہ خود کیسے زندہ ہے۔ ساس تو تھری ڈھیٹ ہڈی' تیر اپنائی مر رہا ہے تو تو خود مر جا۔"

"ہائے ہائے' میں کیوں مروں؟" ماسی بدکیں۔

"مجھے نہیں' اس مشتری کو کہہ رہی ہوں۔" بے بے کو غائبانہ مشورہ دینے کی عادت تھی۔

"اور ہاں بتولاں' وہ تیرے دادکوں کا کوئی رشتے دار' وہ تیرے دور کا چاچا بھی تو یہیں رہتا تھا' تیرے گھر کے پاس۔ وہی مرد مود جو دو ٹانیاں پکڑ کا پکا ہے۔"

"وہ پرانی بات ہے' اب تو نیسری بھگتائے بھی چھ سال ہو رہے ہیں۔ یہیں رہتا ہے چاچا' یہ دیوار سے دیوار ملی ہے۔"

"میں مرجاواں نی۔" بے بے ہاتھ ملتی اٹھ بیٹھیں۔ "تین تین؟ اور ایک بھی نہ بس سکی۔ کتنے لنڈورے مرجاتے ہیں اور ایک جورو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ اوھر یہ

ناقدری..... وجہ کیا تھی؟"

"کہتا تھا اولاد نہیں ہوتی۔"

"لے..... تین کی تین ہی اسے بنجر بانجھ ملیں؟ میں تو کہتی ہوں' اسی میں ہی عیب ہوگا' ورنہ تین میں سے کوئی ایک تو تک جاتی۔" بے بے کا لہجہ سرگوشیانہ ہوا۔

"نہ اولاد' نہ بیوی..... کہا کیا ہے؟ اس کی تو چنگی بھلی زمین جائیداد تھی۔"

"زمین اب کدھر رہی۔ ہاں یہ مکان اور پچھلی گلی میں دو تنگ سی کوٹھریاں ہیں۔ وہ چھٹروں کو کرائے پہ چڑھا دی ہیں اور اس مکان میں جس میں رہتا ہے' خسرے لا گھسائے ہیں۔"

اس اطلاع پہ بے بے پھڑک پھڑک گئیں۔

"واہ جی خسرے..... اللہ مالک ای جوڑی۔"

مجھے رات تک ان سے اکیلے میں بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ وہ نو بجے ہی سوتی پڑ گئیں۔ میں رت جگے کی عادی' ہفتے کی یہ اکیلی رات یونہی جاگ کر گزارنا تھا۔ صبح کہیں پو پھٹنے کے نزدیک سویا تو حسب معمول گیارہ بجے آنکھ کھلی۔ بے بے ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کے ماسی کے ساتھ لاہور میں رہنے والے رشتے داروں سے میل ملاپ کرنے روانہ ہو چکی تھیں۔ شام ڈھلے ان کی واپسی ہوئی تو میں فیکٹری جانے کے لیے تقریباً تیار تھا۔ ان کے چہرے پہ پھیلی سرشاری دیکھ کے بخوبی اندازہ ہو ناتھا کہ ہر جگہ سے انہیں "چنگا چوکھا" کھانے کو ملا ہے۔

"میں آئی ہوں تو تو نکل رہا ہے۔"

"میرا تو یہی وقت ہے نکلنے کا۔ اگر آپ واقعی مجھ سے ملنے آئی ہیں تو آپ کو میرے لیے گھر پہ رکنا چاہیے۔ پھر بھی شکریہ۔"

بے بے سے خفگی جتاتے جتاتے میں نے کوٹر کے ہاتھ سے وہ شرٹ لی جو وہ استری کر کے لائی تھی۔ میں ایسے کاموں میں اسے تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ ہفتے بعد کپڑے دھولی کو دھلنے دے آتا اور استری خود کر لیتا۔ آج اس سے استری مانگ لیا تو وہ خود کپڑوں کا ڈھیر سامنے رکھے استری کر رہی تھی۔ مجھے بعد میں آنے کو کہا اور اب خود شرٹ پریس کر کے لا دی۔

"تکلیف کی کون سی بات ہے' ایک شرٹ ہی تو ہے جہاں اتنا ٹھہر گیا' وہاں یہ کرتے میرے ہاتھ ٹوٹتے تھے کیا۔"

اپنے مخصوص اکھڑ انداز میں جواب دے کر وہ باہر جا چکی تھی۔

"آئی تو میں واقعی تم سے ملنے تھی لیکن پھر میں نے سوچا۔ آئی ہوں تو اور کام بھی نمٹا لوں۔" کیا حکم ملا۔

وہ پرسوچ انداز میں آنکھیں سکوڑے ہوئے تھیں۔

"یعنی خاندان بھر کے سفر ادی دورے اور پُرتکلف کھانے۔ چائے اور ناشتہ۔" میں نے بٹن بند کرتے ہوئے گلہ کیا۔

"نہیں جھلیا' ایک کام اور ہے۔ اچھا یہ بتا' یہ سارے تیرے ساتھ اچھے تو ہیں؟"

"کتنی بار بتایا ہے بے بے! ماسی وغیرہ سب بہت اچھے ہیں۔ بالکل گھر والا آرام اور اپنا پن ہے' اسی لیے تو سات آٹھ مہینے سے نکاہوا ہوں' ورنہ اب تک جاچکا ہوتا۔"

"اور یہ کڑی..... ویسے تو کوڑے مزاج کی لگتی ہے۔" ان کا اشارہ کوثر کی طرف تھا۔

"عادت سے اس کی۔ ویسے اچھے دل کی ہے۔" شاید پہلی بار میں نے اس کی خوبی کھلے دل سے کسی کے آگے بیان کی تھی۔

"محنتی بھی ہے۔" مجھے اس کی گھر کے کام اور پھوہڑ نکال کریشوں پڑھانے کا بھی خیال آیا۔

"اسی لیے تو..... حلانکہ شکل و صورت ایویں سی ہے۔ اوپر سے ڈانگ کی ڈانگ' پُرسواب ہاتھ میں۔ پڑھی لکھی بھی ہے۔" وہ بڑبڑاہٹ کے سے انداز میں کچھ کہتی رہیں۔ میرے پاس دھیان دینے کا وقت نہیں تھا' جلدی سے جوتے پہنے اور بال بنانے لگا۔

"وے صحیح صحیح بتا پھر کڑی ٹھیک اے ناں؟"

"ہاں بھئی..... اور ٹھیک کیا ہوتا ہے۔" میں ان کی فکرمندی پہ جھنجلا گیا۔ بیٹھے بٹھائے کوثر کے بارے میں مشکوک ہو گئی تھیں۔ اس وقت تو میں چلا گیا' اگلے دن واپسی پہ..... بلکہ واپسی پہ بھی نہیں' واپسی کے خاصی دیر بعد..... دوپہر کے قریب جب میں سو کر اٹھا تب یہ انکشاف ہوا کہ اس ساری تفتیش کا مقصد کیا تھا۔

ماسی کا چہرہ کھلا ہوا تھا' ملامت بھی خلاف معمول کم تھا۔ سلمان کے چہرے پہ آج میرے لیے حسد و رقابت کی بجائے ایک زبردستی کا احترام سجا تھا۔ کوثر غائب تھی اور فوزیہ کسی راز کو اگلنے کے لیے بری طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ بے بے ان سب کے درمیان مہمان خصوصی بنی

سامنے لڈوؤں کا ڈبہ لیے ہوئے تھیں۔ میں آگے بڑھا تو ٹ ایک لڈو میرے منہ میں ٹھونس دیا۔

"چل سلام کر اپنی ماسی اور ماسے کو۔" کیا حکم ملا۔

میں نے اندر آتے ہی سلام کیا تھا۔

"وہ والا سلام نہیں۔ آگے ہو' سر جھکا۔ ہاتھ ملتے تک لے جا کر سلام کر اور پیار لے ان کا۔"

اس ہدایت پہ میں ٹھٹھک گیا مگر صاف انکار کرنا کتابی اور بدتمیزی محسوس ہوا۔

"چل ناں۔" بے بے نے باقاعدہ دھکا دیا۔ میں لڑکھڑا کے سنبھلا اور ذرا جھجکتے ہوئے ان کی ہدایت پہ عمل کیا۔ برا خیال تھا' شاید بے بے ان کی احسان مندی سے مغلوب ہو کے مجھے ایسی فرماں برداری اور برخورداری کا سرٹیفکیٹ دلانے کے لیے کہہ رہی ہیں۔ جیسے ہی سلام کر کے میں نے سر جھکایا' ماما نے خوب داد و تحسین سے نوازا۔ پھیرا اور ماسی نے چٹاچٹ میرا ماتھا چومنا شروع کر دیا۔ وہ دعائیں دینے اور فوزیہ کمال بے تکلفی سے آگر میرے شانے پہ جھول گئی۔ میں اس مظاہرے پہ سٹپٹا گیا۔

"مبارکاں' بھئی مبارکاں....." اب ایک دوسرے کے لڈو ٹھونسے جانے لگے۔

"آج سے حیدر آپ لوگوں کا بیٹا۔" بے بے کی اس کھلی دل آفریبی میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ ٹھیک تھا کہ میں ورا' یہاں اس کے گھر رہ رہا تھا' ان کا رویہ بھی میرے محبت بھرا تھا اور میرا بھی دل خوب لگ گیا تھا لیکن کا مطلب یہ نہیں تھا کہ بے بے مجھ سے خوشی خوشی ت بردار ہو کے مجھے ان لوگوں کو سونپ دیں۔ ماسی اپنے سپوت سے بے زار اور نالاں ضرور تھی' لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ وہ مجھے گود لینے کا فیصلہ کر لیں گی۔

"اور ہماری کونٹر پروین آپ کی۔" ماسی کے اگلے ے سے اور بھی چونکا۔ یعنی اول بدل۔ بے بے کو اس ہاتھ کے پکے کھانے اس قدر بھا گئے کہ انہوں نے ے بدلے یہ سودا کر لیا۔ میرا دل بیٹھنے لگا اپنی بے قراری تھا کہ میں پھوٹ پھوٹ کے رو پڑتا' چاہا تھی۔

"ہائے اللہ' خوشی کے مارے بھائی جان کے آنسو نکل "

"پگلا' یہ رونے کا کون سا موقع ہے۔" بے بے نے سینے سے لگایا۔ "خیر سے میرا پتر لاڈھا (دولہا) بنے گا۔ میں دو مجیں (گائیں) کٹوا کے دیگیں پکاؤں گی۔" (میری شادی کے لیے ان کے ارمان نہیں تک محدود تھے۔)

اس ذکر پہ میرے کان کھڑے ہوئے۔ میں نے ان کے سینے سے سر اٹھا کے سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"ابھی تو صرف بات پکی کی ہے تیری اور کوثر کی۔ زیادہ شوشا نہیں کرنی ہم نے منگنی کی۔ لوگ سڑسڑ کے سواہ ہو جائیں گے اور بدمزگی ہوگی۔ سارے چاؤ ایک ہی دفعہ ویاہ پہ نکالیں گے۔"

ساری بات کھل کے سامنے آئی تو میرا ردعمل عجیب تھا۔ نہ مجھے خوشی ہوئی' نہ دکھ' نہ افسوس۔ ہاں حیرت ضرور ہوئی کہ بے بے کے دل میں یہ خیال کیوں کر آیا جبکہ میری تین تین بہنیں کنواری بیٹھی تھیں۔ اس وقت میں چپ رہا' رات کو ذرا تنہائی ملتے ہی اس سے پوچھا۔

"یہ آپ کو بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی؟ کیا آپ آئی ہی اسی مقصد کے تحت تھیں۔"

"سچ بتاؤں' میں آئی تو صرف تجھ سے ملنے تھی۔ ہاں مگر اوھر آ کے اور ہتھ لاں کو جان پرکھ کے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کی لڑکی کو اپنے گھر لانا ہمارے لیے اچھا رہے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"دیکھ نا تیرے بھائی کی شادی میں نے ماڑے (غریب) بندوں میں کر دی۔ کیا فیدہ ہوا۔؟ نہ جہیز' نہ کھنا' نہ بچھ۔ ہتھ لاں نے دونوں لڑکیوں کے لیے بڑا چوکھا جوڑ رکھا ہے۔ اندر لوہے کی پیٹی اوپر تک کمبلوں و رضائیوں سے بھری ہے۔ برتن طرح طرح کے ہیں کہ کیا بتاؤں۔ زیور بھی بنایا ہوا ہے۔"

"بے بے..... مجھے خاصی کوفت ہوئی۔ "آپ صرف ان کمبلوں' رضائیوں کو اوڑھنے یا برتنوں میں کھانا کھانے کے چاؤ میں ہیں کسی سے بھی شادی کر لوں۔ کل کو آپ کو کسی اور کا کمبل پسند آگیا تو کیا اس سے شادی کرنی پڑے گی۔ جس کا جہیز ہے اس کے کام آئے گا۔" آپ کو اور مجھ کو کیا فائدہ۔ آئے والی کے زیور میں نے یا آپ نے تو پہننے کے نہیں بیٹھ جانے۔"

"لاہور آ کے بھی تو وہی کم عقل کا کم عقل رہا۔ تیرے یا میرے نہیں تو تیری بہنوں کے کام تو آسکتا ہے۔ کیا ہوا جو بھابھی اپنے چار سونے کے سیٹوں میں سے ایک ایک نندوں کو دے دے۔ دو کمبل رضائیاں ایک ایک

ڈنر سیٹ اور واٹر سیٹ دے دے۔ پانچ پانچ عمدہ جوڑے انہیں چڑھا دے۔ کوئی فرق پڑتا ہے؟ آخر شوہر کی ذمہ داری' بیوی کی بھی ذمہ داری ہوتی ہے۔ کل نہ سہی' پرسوں تیری شادی کرنی تو ہے۔ کیوں نہ ایسی عورت آئے جو تیرا بوجھ بانٹے۔ پڑھی لکھی بھی ہے اور تیز بھی۔ ہزار دو ہزار کمانے کے قابل تو یہ خود ہے۔ کم از کم اپنا خرچہ اٹھا سکتی ہے۔ ہم پہ بے شک خرچ نہ کرے اپنی کمائی اور جٹوں کا لڑکا۔۔۔ وہ معمولی عقل والا ہے۔ وہ کسی جوگا نہیں۔ ہو سکتا ہے رحمت کی دکان بھی تجھے ہی سنبھالنی پڑے۔ مکان اور زمینوں میں بھی حصہ سے کوثر کا۔۔۔ یہ اچھا کام کیا جٹوں نے جو چھ سات بچے پیدا کر کے کل کل نہیں ڈالی۔ تین جانوں میں آرام سے حصہ بٹ جائے گا۔"

"مگر بے بے۔۔۔" بے بے کی سوچ سے مجھے حقیقتاً" دھچکا لگا تھا۔

"اگر مگر رہنے دے۔ پتہ ہے ایک ہلکا سا سونے کا سیٹ بنانے میں تجھے کتنے سال لگیں گے۔"

"ہاں ایک سال کی ساری تنخواہ اکٹھی کروں تو شاید۔۔۔"

میں نے دل ہی دل میں حساب لگانا چاہا۔

"اور پورے سال تک ہم لوگ کیا کریں گے؟ ہوا پھانکیں گے؟ نخرے نہ کر۔۔۔ میں نے بالکل درست فیصلہ کیا ہے۔ زیادہ سوچنی یا ہولی (ہلکی عمر کی لڑکی لاکے دخت نہیں ڈالنا۔ اسے تو اپنی تنگھی پٹی اور سرخی پوڈر کی فکر پڑی رہا کرے گی۔ کوثر سیانی ہے اور گھر گھر ہنسی مزاح والی۔۔۔ گزارا کر لے گی۔"

میں نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

میری خاموشی میں کسی قسم کی مجبوری یا سمجھوتہ نہیں تھا۔ یہ سچ تھا کہ میری ہمت دانہی جواب دے چلی تھی۔ یہ تو کلیمنٹ ساچ۔۔۔ مگر سچ' ہر حال سچ ہو تا ہے۔ کسی قسم کا اضافی خرچہ نہ کرنے اور ہر ہار اپنا دل مار لینے کے باوجود بھی جب میں کوئی قابل ذکر بچت نہ کر پایا تو میرے حوصلے ٹوٹنے لگے تھے۔ زمانے کا جو چلن ہو گیا تھا اور جس طرح سفید پوش متوسط طبقے میں بھی غیر ضروری رسومات اور نمود و نمائش کی جو روش تھی' اس کو دیکھتے ہوئے لگتا تھا مجھے اپنی کسی ایک بہن کو بھی باعزت طریقے سے رخصت کرنے کا خواب ترک کر دینا چاہیے لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ بے بے کی باتوں نے مجھے قائل نہیں کیا تھا۔ الٹا مجھے ایک بے چینی نے گھیرے میں لے لیا تھا۔ مجھے اپنے ہونے پہ ہی الجھن محسوس ہونے لگی تھی۔

اسی بے چینی اور الجھن کے خاتمے کے لیے میں نے کوثر پروین کے لیے آمادگی ظاہر کر دی۔ وہ کوثر پروین جس کے ساتھ ایک ہی گھر میں پچھلے سات آٹھ مہینے سے رہتے ہوئے یہ خیال ایک بار سرسری سا بھی میرے ذہن کو چھو کر نہیں گزرا تھا۔

☆ ☆ ☆

فیکٹری سے واپس آتے ہی میں نے بے بے کو یقین میں بٹھا دیا تھا۔ وہ بڑی خوش خوش لوٹ رہی تھیں۔ ماسی نے انہیں ایک لان چکن کا سوٹ اور ایک شیفون کا کڑھا دوپٹہ تحفتاً" دیا تھا' ساتھ میں مٹھائی کا پورا ٹوکرا۔

روز ناشتہ کو ثر پروین کے ہاتھ سے ہضم جاتا تھا۔ آج ان نے برے کرار سے میرے سامنے رکھا۔ میں کوثر کے بارے میں پوچھتا ہی رہ گیا۔ بہت دل چاہ رہا تھا اس نے رشتے میں بندھنے کے بعد اس کو دیکھنے کو' اس کا انداز کر سکوں اس کے تاثرات کیا ہیں' مگر وہ تھی کہ نجانے کہاں خندق کھود کے بیٹھی تھی' نظر ہی نہیں آتی تھی۔

"مہمان چلے گئے' بہن؟" دیوار پار سے باجی ساجدہ کا سر نمودار ہوا۔

"خیر تو ہے' بڑی مٹھائیاں لے کر رخصت ہوئی ہیں تمہاری یہ رشتے دار؟ کیا بات ہے؟" انہوں نے نوالہ چاہی اور میں نے ناشتے کے لیے بیٹھ کر سکھ کچھ اور بھی بڑھا دیا۔ میری اور کوثر کی منگنی کی خبر سننے کے بعد وہ کسی بھی کام کاج سے لاگ نہ رکھ سکتی تھیں مگر مجھے ماسی کے جواب پہ حیرت ہوئی۔ وہ باجی ساجدہ کو ٹال رہی تھیں۔

"بات کیا ہونی ہے ساجدہ! ویسے ہی میری یہ بہن مطمئن کی شوقین ہے اور لاہور کی مٹھائیوں کی تو بات ہی اور ہوتی ہے' اس لیے میں نے نوکر ساتھ کر دیا۔ ویسے بھی میری برادری کے بہترے لوگ اور ہر دوگنہ بونگہ میں رہتے ہیں۔ ساروں کو بھجوانے کے لیے دی ہے۔"

"ہی تو میں پوچھ رہی ہوں۔ آخر رشتے داروں میں مٹھائی کسی خوشی کے موقع پہ ہی بانٹی جاتی ہے۔" وہ کہاں آسانی سے ٹلنے والی نہیں تھیں۔

"مٹھائی مفت میں کھانے کو مل جائے' اس سے اچھا خوشی کا موقع اور کون سا ہو سکتا ہے۔" میں سمجھ گیا تھا ماسی ان سے میرا' اور اپنی بیٹی کا رشتے کے طے ہو جانے کی خبر کو چھپانا چاہتی ہیں۔ کیوں۔۔۔؟ یہ تو مجھے نہیں پتا تھا' پھر بھی میں نے ان کی مشکل کم کرنا چاہی۔ پتہ نہیں ان کی تسلی ہوئی یا نہیں۔ البتہ برے برے منہ بناتی ہوئی وہ دیوار سے ہٹ ضرور گئیں۔

میں نے آخری لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے ماسی کی جانب دیکھا تو وہ نظریں چرا رہی تھیں۔ اگرچہ مجھے یہ برا ضرور لگا تھا کہ ایک نیا رشتہ قائم ہو جانے کے بعد بھی انہوں نے اسے چھپانا چاہا۔ کیا مجھے بطور داماد کے وہ پسند نہیں کرتیں یا میں ان کے معیار کے مطابق نہیں ہوں جو میرا تعارف بطور اپنے ہونے والے داماد کے کرواتے ہوئے انہیں شرم آرہی ہے پھر بھی میں نے کوئی سوال کرنا مناسب نہ جانا اور چپ چاپ اٹھ کھڑا ہو گیا۔

ماسی نے میرا ہاتھ روکا مجھے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میرے کچھ زیادہ نزدیک کھسک آئیں۔

"بیٹا! برا نہ ماننا' میں نے محلے میں یہ خبر کسی وجہ سے نہیں بتائی اور ابھی فی الحال بتانی بھی نہیں ہے۔ تمہیں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ کہیں تم باہر کسی بات پہ لڑکی کو طعنہ نہ دینا۔" ان کا لہجہ سرگوشیانہ تھا لیکن جب میں بولا تو غصے کی وجہ سے آواز بلند تھی۔

"کیوں۔۔۔؟ ایسی کون سی معیوب بات ہے یہ؟ اور اگر اتنا برا لگ رہا ہے تو آپ اس رشتے پہ راضی ہی کیوں ہوئیں؟"

میرے بلند لہجے پہ وہ گھبرا کے ادھر ادھر دیکھنے اور ہاتھوں کے اشاروں سے مجھے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگیں۔

"ہولی۔۔۔ ہولی (آہستہ) یہ ساجدہ خود اندر چلی بھی جائے تو کان دیوار کے ساتھ لگا جاتی ہے۔" وہ دیوار کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتے لگیں جیسے باجی ساجدہ دیوار ہی تو ہوں۔

"مجبوری ہے پتر۔۔۔ تو تو سمجھ دار ہے' خود سوچ۔ یہ غریب مگر شریف لوگوں کا محلہ ہے اور آج کے زمانے میں سب سے نازک چیز شرافت ہی تو ہے۔ شریف بندے کو ہی ہر طرف سے خطرہ ہوتا ہے۔ عزت ہی ہر وقت نشانے پہ رہتی ہے۔ اگر میں نے کوثر کی اور تیری منگنی کی بات پھیلا دی تو سارے تیرے اس گھر میں رہنے پہ اعتراض کریں گے' سو باتیں بنیں گے کہ لڑکی لڑکا شادی سے پہلے ایک ہی گھر میں رہ رہے ہیں یا یہ کہ ہونے والا جوئی شادی سے پہلے ہی سوہرے کے گھر رہ رہا ہے۔"

میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ماسی گھبرا کے میرے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگیں۔

"صدقے جاواں۔۔۔ پریشان نہ ہو بلکہ تجھے اس پریشانی سے بچانے کے لیے ہی تو اتنا کیا ہے نا کہ تجھے کسی کی ٹکے ٹکے کی بات نہ سننی پڑے' ورنہ کوثر نے تو میرے لیے تیرے جیسا داماد ملنے کی خبر پہ تو میں سارے محلے میں لڈو بانٹتی۔ اب تو خسرے بھی ہمارے ہمسائے ہو گئے ہیں۔ ایک آواز دینی ہی ہے نا اور ان کو بلوا کے ناچ کروانا تھا لیکن خوشی منانے سے زیادہ ضروری عزت سنبھالنا ہے۔"

"میں کوشش کروں گا کہ جلدے جلد ارجلد کرائے کا گھر مل جائے۔"

معاملے کی سنگینی مجھ پہ واضح ہو گئی تھی' اس لیے میں نے فیصلہ سنجیدگی سے کہا۔

"خوامخواہ۔۔۔" وہ برہان گئیں۔ "بڑے پیسے ہیں نا تیرے پاس جو کرائے میں دینے ہیں۔ چپ کر کے بیٹھا رہ۔۔۔ یہ گھر تیرا ہے۔ آج بھی اور آگے بھی جب وقت آئے گا' چپ کر کے ماتھ ٹیکی کر لیں گے' تب ہفتے دو ہفتے کے لیے کہیں اور تمہارا بندوبست کر دیں گے۔ پہلے سے رولا ڈالنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

انہوں نے محبت بھری زبردستی سے بات ختم کر دی۔

☆ ☆ ☆

محبت تو یہ سب پہلے بھی کم نہیں کرتے تھے۔ خصوصاً" ماسی اور مامار حمت لیکن اب یہ محبت دگنی ہو گئی تھی۔ بات اگر صرف محبت تک محدود رہتی تو ٹھیک تھا لیکن اب اس محبت میں خاصی حد تک تکلف بھی شامل ہو گیا تھا۔ وہ میرا اتنا خیال رکھتے کہ میں نے پہلی بار خود کو مہمان تصور کرنا شروع کر دیا۔ سلمان کو کنتھا ئی منہ پھٹ اور بدلحاظ تھا مگر میرا لحاظ کر جاتا تھا۔ کبھی میرے ساتھ فضول گوئی کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی اور اب۔۔۔ اب تو وہ اتنا احترام کرتا کہ اس میں مصنوعی پن جھلکنے لگتا۔ لاپروا اور کند ذہن سی فوزیہ کو میری پیدا کی اکثریتی رہنے لگی۔

"بھائی جان! چائے پئیں گے؟"

"بھائی جان! کرسی تو نہیں لگ رہی۔۔۔؟ شرمت۔۔۔؟"

میں یہ بڑے بہنوئی والا اسٹیٹس پا کے جلد ہی گھبرا گیا۔ مجھے ماسی کے بگڑتے بجٹ کی بھی فکر ہونے لگی۔ اب وہ روز

ہی کچھ نہ کچھ خاص پکا کے میرے لیے رکھنے لگیں۔ میٹھا بھی آئے دن بننے لگا۔ ماما رحمت روز میرے لیے واپسی پہ پھل یا مٹھائی ہی تو لانے لگے۔ اور تو اور کوشہ بھی انتہائی بور اور بدمزہ ہوگئی۔ وہ روز کی جھڑپ، وہ نوک جھونک، وہ کھٹی میٹھی تکرار خواب ہوگئی تھیں۔ پتہ نہیں کہاں اندر گھسی رہتی تھی وہ۔ سامنا ہو بھی تو زمانے بھر کی سنجیدگی چہرے پہ طاری کرکے ادھر ادھر ہو جاتی۔ میری تو ہمت نہیں پڑتی تھی اسے مخاطب کرنے کی۔ ڈر لگتا کہیں جواب میں پھر نہ تھپڑ مار دے۔ مجھے سامنے پاکے اس کے تاثرات کچھ ایسے ہی۔ بگاڑ ہو جاتے تھے۔

انہی دنوں بھاحنیفہ کے چھوٹے بھائی کی شادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا۔ گاؤں سے ان کے ماں باپ اور بھائی بہن شادی کے لیے بیس اٹھ آئے۔ لڑکی اس شہر کی جو تھی۔ میرا لاہور میں ہونے والی کسی بھی شادی کو دیکھنے کا پہلا اتفاق تھا اور عام سے متوسط گھرانے میں ہونے والی اس شادی کے دھوم دھڑکے کو دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

کہاں ہمارے ہونگہ۔ ہونگہ میں ہونے والی دن کی شادیاں، مہندی ہوتی تھی لیکن ابھی تک کم از کم ہمارے خاندان میں مردوں اور لڑکوں کا اس رسم میں شریک ہونا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لڑکیاں عورتیں خود ہی جمع ہوکے چار مہندی کے تھال موم بتیوں سے سجا کے چلی جاتی تھیں۔ اگلے دن دوپہر کو گلی میں پاجامہ پہ قمیضیں وغیرہ لگ جاتیں، پہ رنگین دریاں اور کرسیاں، پھر جاتیں گرمی کا موسم ہوتا تو اس پاس کے گھروں سے کنکشن لے کر اطراف میں پیڈسٹل فین لگا دیے جاتے۔ بارات کی تواضع دیگ کے سالن، نان اور زردے سے ہو جاتی۔ میٹھے میں قیمتی۔ بہت کھاتے پیتے لوگ ایک آدھ ڈش کا اضافہ کردیتے اور بوتلیں بھی پلا دیتے مگر یہاں مہندی کے لیے ہونے والی تیاریاں ہی نظر خیرہ کرنے کے لیے کافی تھیں۔

گلی کے نکڑیہ واقع رستگاری اسکول کا گراؤنڈ کرائے پہ لیا گیا تھا۔ پیلے رنگ کے شامیانے لگا کر اندر سبز دریاں بچھائی گئی تھیں، بہن پہ سرخ اور پیلے غلافوں والے گاؤ تکیے رکھے گئے تھے۔ یہ اہتمام غالباً "ڈھولک بجا کر گانے والی لڑکیوں کے لیے تھا۔

مہندی کی رسم ادا کرنے کے لیے اسٹیج بنایا گیا تھا جس پہ پیلے پھولوں سے سجا پنجرہ رکھا تھا۔ پانچ چھ سو تو کرسیاں تھیں۔ دیگیں بھی کئی قسم کی تیار ہو رہی تھیں۔ اس کے علاوہ میوز کسٹم تو کمال کا ارینج کیا گیا تھا۔ میں بھاحنیف کے ساتھ دن کو وہاں انتظام کا جائزہ لینے گیا تو رنگ رہ گیا۔

"اتنی کرسیاں، لگتا ہے کافی تعداد میں لوگ آرہے ہیں وہاں سے؟"

"ہاں تین سو کے قریب ہیں، اتنے ہی ادھر سے ہو جائیں گے۔ ابھی تو تم کل کا دھوم دھڑکا دیکھنا، کل ہمارے ہاں سے مہندی جائے گی اور پانچ سو لوگ ہوں گے۔ لڑکی والوں نے ہال بک کرایا ہے اور صرف اور صرف بارلی کیو کا انتظام ہے۔ سیخ کباب، چکن تکہ، چانپ تکہ اور کٹاکٹ۔"

"اتنا خرچا کروانے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے دبے الفاظ میں کہنا چاہا۔

"کوئی ہم نے اپنے منہ سے کہا ہے؟ وہ اپنی خوشی سے کر رہے ہیں۔ بارات کا کھانا بھی ہوٹل میں دے رہے ہیں، جہاں فی کس خرچہ پانچ سو روپے ہے۔ دراصل ہم پہ رعب ڈالنا چاہ رہے ہیں۔ لیکن ہم کوئی کسی سے کم ہیں۔ ایسا ولیمہ ہوگا کہ ان کی مہندی اور بارات کا کھانا جلا دیں گے لوگ۔ میرا ایک بہنوئی خود انکیٹر ہے، اس کی بدولت ایک اچھے ہوٹل میں تقریباً "منت ہی سارا انتظام ہو جائے گا۔"

وہ فخریہ اپنے بھی کسی بہنوئی کا تذکرہ کر رہے تھے اور میں تاسف سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے انہیں اپنے وہ سارے وعدہ بھولے ہوئے تھے جو وہ ہم لوگوں کو اٹھا کر کے اکثر ہی دیا کرتے تھے اور اپنی ذہنی علمیت جھاڑنے کا متاثر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ سرپہ ٹوپی رکھے اور ہاتھ میں تسبیح پکڑے ہوئے وہ اس وقت اپنے دین کی سب سے پیاری بات یعنی قناعت اور سادگی کو یکسر نظر انداز کیے ہوئے تھے۔

"تو تیار نہیں ہوا۔" ماسی نے مجھے کسلمندی سے پڑا دیکھ کے کہا۔

"ماسی! مجھے کام پہ جانا ہے، میں کیسے جاؤں۔ ویسے بھی یہ مہندی، ماؤں وغیرہ عورتوں کے فنکشن ہیں۔"

"وہ پرانی باتیں ہیں، اب تو منڈے زیادہ جگ کے جاتے ہیں۔ کام والے لڑکے پھرکتا اور مونڈے (کاندھے) پہ رنگین دوپٹے ڈال کے۔"

انہوں نے تیکھی نظروں سے اپنے ہونہار کو دیکھا جو سلور اور میرون کام والے کالے کرتے اور سادہ سفید شلوار میں ملبوس گھنٹہ بھر سے آئینے کے آگے جما اپنے چنے ہوئے میرون اور بلیک دوپٹے کو سیٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"دیکھو ذرا! پہلے ہم زنانیوں کو مصیبت پڑی ہوئی تھی، دوپٹے چادر کی کہ ایسے سنبھالو، ویسے اوڑھو۔ اب یہ چٹکے بھلے مرد بھی اس کام میں لگ گئے ہیں۔ ادھر آ، میں سیٹ کروں تیری چنی۔"

انہوں نے اس کے دوپٹے کے دونوں پلو کاندھے سے پیچھے کی طرف پھینکے اور آگے سے کھینچ کے سینے پہ "دی" کی صورت سیٹ کردیا اور خود ہی منہ پہ ہاتھ رکھ کے ہنسنے لگیں۔ اونچا لمبا، پھرتکے مسلز والا سلمان پوں شریف بیبیوں کی طرح سینے پہ دوپٹہ ڈالے ایسا مضحکہ خیز لگ رہا تھا کہ میرا قہقہہ بھی بے ساختہ بلند ہوگیا۔ سلمان نے ہنسنا کے دوپٹہ نوچا۔ اب وہ ہونے والے ہنوئی کو تو کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ ماں کو گھورے دکھاتا، پھر دھپ دھپ کرتا ہوا اوپر چڑھ گیا۔

"وے گل تے سن جھلیا۔" ماسی اسے منانے لگیں۔ میں بھی فیکٹری جانے کے لیے تیاری پکڑنے کی نیت سے اٹھا۔ پر آدھے میں مڑتے ہوئے اچانک ہی کوشہ پروین سے ٹاکرا ہوگیا۔ خلاف معمول آج وہ بھی خاصی لشک رہی تھی۔

اگرچہ گہرے جامنی رنگ کا سوٹ اس کی سانولی رنگت کو اور بھی دبا رہا تھا۔ اس کے باوجود نئے اسٹائل سے بنائے بال اور ہلکے ہلکے میک اپ کے ساتھ وہ ٹھیک ٹھاک ہی لگ رہی تھی۔ مجھے یاد آیا، یہ سوٹ وہی تھا جو پچھلے رمضان ٹیوشن پڑھاتے ہوئے مسلسل اس کے ہاتھ میں رہا۔ اس پہ وہ خاصی جانفشانی سے کام کر رہی تھی۔ اس کی محنت کا شاہکار، یہ ستارے اور موتی ٹنکا سوٹ..... آگے سے اٹھا کے بنائے اور پیچھے سے کھلے ہوئے بال، ہاتھوں میں چوڑیاں، پیروں میں پازیب اور میک اپ..... میں پہلی بار اس روپ میں اسے دیکھ رہا تھا، اس لیے میرے انداز میں اچنبھا اور اور تھوڑی تھی۔ وہ کچھ گھبرا سی گئی۔

"کچھ چاہیے؟"

"ہاں۔"

"کیا؟" وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"کیسرو۔"

"جی۔" پہلی بار اس نے اتنے ادب سے مجھے "جی" کہا تھا۔ بڑی "بیوی بیوی" سی لگی۔

"ہاں، کاش میرے پاس کیمرہ ہوتا تو میں تمہارے اس روپ کو اس میں محفوظ کرلیتا۔"

تھنکنگی کے بعد یہ میرا اس سے پہلا جذباتی و رومانوی مکالمہ تھا جو میں نے غیر ارادی طور پر کہہ ڈالا۔ شاید یہ تنہائی کا اثر تھا یا ہم دونوں کے مابین اس خوبصورت رشتے کی نزاکت کا احساس یا پھر اس کے بدلے بدلے روپ اور تیور کا فسوں۔

"میں نے کہا، یہ نہیں ماں سے ناراض ہو کے اوپر چڑھ رہا ہے۔ چلو میں مثالاؤں آپے بیٹے کو لیکن ناں جی....."

ماسی کی اونچی آواز اور سیڑھیوں سے اترنے کی دھپ دھپ سنائی دی۔ وہ یوں گھبرائی جیسے چوری کرتی پکڑی گئی ہو۔

"وہ تو اس بے حیا کو دیکھنے بھاگا تھا جو شرما شرما کر کچھ کے اپنا آپ دکھانے کے لیے اوپر سے نیچے ہوئی تھی۔"

ان کی آواز اور نزدیک ہوئی تو میں جھپاک سے اس کمرے میں گھس گیا جو تھا تو سلمان کا مگر دن بھر میرے ہی استعمال میں رہتا تھا کیونکہ سلمان کو سڑکیں ناپنے سے فرصت نہ تھی اور مجھے آرام کرنے سے۔

"ہیرہ غرق" کرنے یہ والا جوڑا کیوں پہن لیا، ٹوانں نکوو۔ یہ تو میں نے تیرے جہیز میں رکھنے کے لیے بنوایا تھا۔"

کوشہ کو اس جامنی جوڑے میں دیکھ کے انہیں دلی صدمہ پہنچا۔

"تو کیا پہنتی جو بھی اچھا جوڑا بنے، پہننا بھی نصیب نہیں ہوتا۔" وہ بڑبڑائی۔

"آگے جا کے تو نے ہی پہننے ہیں، کوئی تیری ساس تو پہن کر جھمکتی نہیں پھرے گی۔"

"اوہو..... وہ کھرا کے شاید ماں کو اشارے کرنے لگی تھی۔ ماسی کو بھی یاد آگیا کہ اس کی ساس کوئی اور نہیں، میری بے بے ہی ہوگی اور میں اندر بیٹھا یہ سب سن بھی سکتا ہوں اور اپنی والدہ کے بارے میں "جھمکنے" جیسا لفظ استعمال کرپر ابھی مان سکتا ہوں۔

"میرا مطلب ہے تیری چیز ہے، تیرے ہی کام آئے گی۔ اتنی آتھل اور بے صبری نہ بن۔ لڑکی ذات یہ یہ تھوڑی ہی اچھی نہیں لگتی۔ جاشاباش، یہ اتار کے تہہ کرکے ٹرنک میں سنبھال دے اور وہ عید والا گہرے رنگ کا جوڑا پہن لے۔"

"نہیں اماں..... اب نہیں، وہ..... وہ نعیمہ ہے نا، وہ آئی

تھی اور اس کے ساتھ بے بی بھی تھی' ان دونوں نے مجھے اس نئے جوڑے میں دیکھا ہے' اب اگر میں اتار کے پرانا والا پہن لوں گی تو وہ سوباتیں بنائیں گی۔ میں نہیں بدلنے والی۔"

بہت آہستہ آواز میں وہ بہت دھیرے سے کہہ رہی تھی۔ میں اندر شرٹ پہنتے ہوئے مسکرایا۔ وہ کسی نعیمہ یا کسی بے بی کی وجہ سے نہیں بلکہ میری وجہ سے ایسا کہہ رہی تھی۔

"اچھا' مرچیں۔" آنکتا کے وہ اجازت دے۔ بتیسیں' نگر بے شمار ہدایات کے ساتھ۔

"دھیان رکھنا' کوئی داغ نہ لگے۔ پلیٹ بھر کے نہ کھانے بیٹھ جانا۔ ادھر کسی نے مونڈا (کاندھا) مارا' ادھر سارا سالن اوپر گرا۔ اور نہ مہندی لے کر آگے آگے ہونا۔ جالی کا دوپٹہ اک جلدی پکڑتا ہے۔ اور مہندی کا داغ بھی نہیں اترتا۔"

"اوہو اماں! اس رنگ پہ کون سا داغ لگ سکتا ہے۔ ویسے بھی مہندی کی رسم میں آگے کس نے ہونے دینا ہے۔ باجی ساجدہ کی ساری بہنیں بڑی شرلیاں ہیں۔ انہوں نے تو بھاحنیف کے گھر والوں کو کوئے میں لگا دینا ہے۔ اچھا اماں! وہ نہ جھمکیاں تو نکال دینا۔" اس نے بڑے منت بھرے لہجے میں کہا۔

"کون سی جھمکیاں؟"

"وہی' جو میں نے کینٹی نکلنے پہ بنوائی تھیں۔ سبز نگوں والی' وہ اس جوڑے کے ساتھ پہنوں گی۔"

"آرام سے بیٹھ' جوڑا پہننے کی اجازت کیا دے دی۔ پھتر کی طرح چوڑی ہوتی جارہی ہے بھول جاوہ جھمکیاں۔"

"لے بھول جاؤں' میں نے اپنی ٹیوشن کے پیسوں میں سے کینٹی والی ہے۔ ابھی ڈیڑھ سال تک ہر مہینے چار سو روپے دینے ہیں مجھے۔ وہ میری جھمکیاں ہیں اور میں آج پہنوں گی۔"

"زیادہ رعب نہ ڈال میرے' یہ اپنی چار سو کی کینٹی کا' جیسے تیری وہ کینٹی نہ نکلتی تو تو نے کبھی سونے کی شکل نہیں دیکھنی تھی۔ یا تیری ان تولے بھر کی جھمکیوں کی بھوکی بیٹھی ہوں میں۔ میرا سونا تھا' میرے پاس۔ جنیز اور بری کی۔۔۔ برے وقتوں میں کافی کچھ گیا۔ تیرے اور فوزیہ کے لیے دو دو سیٹ اور کڑے بچا رکھے ہیں۔ سلمان کی دو بہنی کے لیے۔"

"میں اس میرسونے کا نہیں پوچھ رہی۔ اپنی جھمکیوں کی بات کررہی ہوں۔"

"بدنظر۔۔۔ بدنیتی۔ ایک ہی بات بار بار کرتی جارہی ہے۔ کوئی نہیں ملنی وہ جھمکیاں' کنواری لڑکی کا کیا کام سونے کی چیز سے۔ شادی کے بعد پہننا۔ چک پھیلی پڑ گئی تو لوگ طعنے دیں گے کہ جھوٹے سونے کا زیور پہنا ہے۔"

"تو بس۔۔۔ کوئی چیز میرے نصیب میں نہیں' ہر چیز کے ہوتے ہوئے بھی ترستے رہو۔ ایک سے ایک کپڑا' جوڑا اور زیور بکسوں میں پڑا سڑ رہا ہے۔ اور میں دس روپے والے گھٹیا ٹائپ پہن کے سو روپے کی سینڈل میں جارہی ہوں۔"

"شکر کرو' بکسوں میں تو ہے۔ اوروں کو تو یہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اور اللہ خیر کرے۔ پڑا سڑ کیوں رہا ہے۔ بڑے شگنوں کی چیزیں ہیں۔ بری بات۔ ایسے نہیں کہتے۔ اللہ پہننا نصیب کرے۔ تیری ہی ہیں۔"

وہ اسے بہلا پھسلا رہی تھیں اور جوتے کے تسمے باندھتے میرے ہاتھ سُست پڑ گئے۔ مجھے بے بے کے کہے الفاظ یاد آرہے تھے۔

"کیا ہوا جو بھابھی اپنے چار سونے کے سیٹوں میں سے ایک ایک اپنی نندوں کو دے دے۔ دو دو مکبل رضائیاں ایک ایک دَرجن سیٹ دے دے۔ پانچ پانچ عمدہ جوڑے انہیں چڑھا دے۔ کوئی فرق پڑتا ہے۔"

"ہاں فرق تو پڑے گا۔۔۔ بہت فرق پڑے گا بے بے۔" اس وقت میں خاموش رہ گیا تھا لیکن اب میرا دل یہ کہہ رہا تھا۔

"بہت پڑے گا اس لڑکی کو جس کے لیے یہ محض جہیز کی چند چیزیں نہ ہوں۔ اس کے کنوارپن کے سارے ارمان' ساری خواہشات اور ساری آرزوئیں ان چیزوں میں بند ہوں۔ جس کی انگلیاں گرم دوپہروں میں ان چادروں اور دوپٹوں کو کاڑھتے ہوئے فگار ہوئی ہوں' جس نے دل مار مار کے پائی پائی جوڑی ہو ان کو خریدنے کے لیے۔ اور جس کے ماں باپ نے اپنے کتنے خرچے اور ضروریات نظر انداز کرکے بچی کے لیے یہ بندوبست کیا ہو۔"

"آخر شوہر کی ذمہ داری' بیوی کی بھی ذمہ داری ہوتی ہے۔ کل نہ سہی' پرسوں سہی' تیری شادی تو کرنی ہے۔ کیوں نہ ایسی عورت آئے جو تیرا بوجھ بانٹے۔"

بے بے کے فرمودات نے ایک بار پھر مجھے بہکانا چاہا۔

"اور میں اپنی ذمہ داری' کیا وہ کچھ نہیں؟ آنے والی

میری ذمہ داری بانٹنے لیکن میں اس کی ذمہ داری نہ اٹھاؤں' یہ کیسا رشتہ ہے۔ کیا بیوی صرف بوجھ بانٹنے کے لیے ہوتی ہے۔"

اس سوال نے مجھے بوجھل کردیا۔

کچھ دیر قبل کی خوش سے ہونے والی ہلکی پھلکی باتوں نے جس لطیف احساس سے دوچار کیا تھا وہ کیفیت زائل ہونے لگی۔ اس کی جگہ ایک احساسِ جرم نے لے لی۔

☆ ☆ ☆

شادی کا دن تھا اور پہلے کی طرح اس روز بھی بے بے بغیر اطلاع کے آگئیں۔ ایک تو محض پندرہ بیس دن کے بعد ہی ان کا دوبارہ لاہور آنا بھی میرے لیے باعث حیرت تھا اس پہ وہ تینوں بہنوں کو بھی ساتھ لے آئیں۔

"جب سے انہیں بھابھی کے بارے میں بتایا ہے' تب سے مچل رہی ہیں کہ بس بھابھی دکھلاؤ۔ بھابھی دکھلاؤ۔ دن رات ناک میں دم کیا ہوا تھا۔ میں نے کہا چل آپھر۔۔۔ چار دن رہ آتے ہیں۔ میرا اپنا دل اداس ہو رہا تھا اپنے بیٹے اور بہو کو دیکھنے کے لیے۔"

بے بے اور لگاوٹ کا ایسا بھرپور مظاہرہ' ناقابلِ یقین سی بات تھی۔ چونکہ شادی پہ جانا تھا' اس لیے دوپہر کا کھانا بھی تیار نہیں تھا۔ ماسی نے بھگدڑ مچادی۔ فوزیہ اور کوثر جوتیاریوں میں مگن تھیں۔ اب پتن جاکے کھانا پکانے کے خیال سے منہ لٹکائے رہ گئیں۔

"سلمان!۔۔۔ سلمانا وے۔۔۔ نیچے اتر جاکے ایک مرغی پکڑلا۔۔۔ آتا بھی ہیں گوندھا ہوا سات نان لے آنا۔ اتنے میں تو کوثر تو سالد بھون کے تیار رکھ۔"

"ہائے ہائے۔۔۔ اتنی۔۔۔ شکر دوپہر ہوگئی اب تک ہانڈی نہیں چڑھائی؟"

بے بے نے ناک بھوں چڑھائی' پھر نئے سرے سے کوثر کا جائزہ لیا جو نیا دوپٹا اوڑھے' بھرپور چوڑیاں کلائی میں ڈالے' نیم گیلے بالوں کو سلجھاتی ہوئی یوں کھلا کھلا پھوڑے کے انہیں سلام کرنے آگئی تھی۔ اور فوزیہ وہ تو مکمل تیاری میں تھی اور اپنی سر جھاڑ منہ پھاڑ بیٹیوں کے مقابلے میں انہیں یہ تیاری خاصی کھٹکی۔

"اپنا ہی منہ بوتھا اٹکانے میں جو لڑکیاں لگی رہیں۔ ان کے چولہے ایسے ہی الٹے پڑے رہتے ہیں۔"

"نہیں نہیں بہن! میری لڑکیاں تو کام کاج میں بڑی تیز ہیں۔ آج ساتھ والے گھر میں شادی ہے' وہاں جانے کے خیال سے کچھ نہیں پکایا تھا۔ ہمارا سارا انہر سدّا (مدعو) ہوا ہے۔"

"تو پھر ہم بھی روٹی وہیں کھالیں گے۔ نہر میں ہم بھی تو شامل ہیں۔"

بے بے کی بات پہ ماسی کچھ جزبز ہوئیں شاید وہ بن بلائے مہمانوں کی نفری میں اضافہ کرکے باجی ساجدہ کی باتیں نہیں سننا چاہتی تھیں۔

"پر شادی ہے کس کی؟ اس مُجھڑ کے بال تو بڑے چھوٹے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔۔۔ بچے ہے تو واقعی بہت چھوٹے ہیں۔ ان کی کہاں سے شادی ہوگی۔ شادی تو اس۔۔۔"

"اچھا اچھا' آپ شادی کررہا ہے؟ دودھی؟" بے بے نے پوری بات سنے بغیر اندازہ لگایا۔

"بڑی خوشی ہوئی۔ جی بڑی خوشی۔" وہ مارے خوشی کے جھومنے لگیں۔ "بڑا اچھا کیا۔ ایسی نار سے لالی۔ زنانی کے ساتھ کس کا گزارا ہو سکتا ہے۔ اچھا ہے' سوکن سر پہ آکے بیٹھے گی تو زار آزار ختم ہوگی۔ اس کی۔"

وہ یقیناً ساجدہ باجی کے بارے میں بات کررہی تھیں۔ میں نے گھبرا کے انہیں خاموش کرانا چاہا' کیونکہ باجی چوبیس میں سے بیس گھنٹے تو بوار کے ساتھ لگ کے گزارتی تھیں۔ اگر یہ زریں فرمودات ان کے کانوں میں پڑ جاتے تو بے بے کے ساتھ ساتھ ماسی اور ان کے گھر والوں کا وہاں جانا بھی منسوخ ہو سکتا تھا۔

"سلمان!۔۔۔ سلمانا وے۔۔۔ نیچے اتر جاکے ایک مرغی پکڑلا۔۔۔ آتا بھی ہیں گوندھا ہوا سات نان لے آنا۔ اتنے میں تو کوثر تو سالد بھون کے تیار رکھ۔"

"ہائے ہائے۔۔۔ اتنی۔۔۔ شکر دوپہر ہوگئی اب تک ہانڈی نہیں چڑھائی؟"

بے بے نے ناک بھوں چڑھائی' پھر نئے سرے سے کوثر کا جائزہ لیا جو نیا دوپٹا اوڑھے' بھرپور چوڑیاں کلائی میں ڈالے' نیم گیلے بالوں کو سلجھاتی ہوئی یوں کھلا کھلا پھوڑے کے انہیں سلام کرنے آگئی تھی۔ اور فوزیہ وہ تو مکمل تیاری میں تھی اور اپنی سر جھاڑ منہ پھاڑ بیٹیوں کے مقابلے میں انہیں یہ تیاری خاصی کھٹکی۔

"اپنا ہی منہ بوتھا اٹکانے میں جو لڑکیاں لگی رہیں۔ ان کے چولہے ایسے ہی الٹے پڑے رہتے ہیں۔"

"نہیں نہیں بہن! میری لڑکیاں تو کام کاج میں بڑی تیز

سرکاری افسر ہیں۔ ان کے خیال ہی بڑے اونچے تھے۔ کسی بڑی اور اونچی جگہ ہاتھ مارنا چاہتے تھے۔"

"کیوں میرا حیدر بہت بڑا لکھا نہیں۔ اچھی نوکری نہیں ہے اس کی؟" میں نے بھی تو۔۔۔" اگلا فقرہ انہوں نے منہ میں بُن بُن کرتے ہوئے مکمل کیا جو پوری طرح سنا نہ جاسکنے کے باوجود ماسی کی سمجھ میں آگیا۔ وہ سر جھکا کے رہ گئیں۔ شاید اظہار ممنونیت کے لیے۔

اور میرا سر شرمندگی سے جھک گیا۔

"مجھے تو جی خدا کا خوف ہی پڑا ہے۔ چاہتی تو میں بھی اونچی جگہ بیٹھے کارشتہ کرسکتی تھی لیکن۔"

"لیکن آپ کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا ہے بے۔" میں نے بے وقت مداخلت کی ورنہ وہ یونہی ماسی کا دل برا کرتی رہتیں۔

"اونچی جگہ والے بھی کچھ دیکھ کے ہی بیٹی کا ہاتھ دیتے ہیں۔ بھانجیے کا بھائی سرکاری ملازم ہے۔ بہت بڑا افسر نہ سہی مگر نوکری تو پکی ہے اور ایسی ہے۔ جس میں کھانے کھلانے کی خاصی گنجائش ہے۔"

"مرس دونوں۔۔۔۔ رشوت خور جنہی کھانے والے بھی اور کھلانے والے بھی۔"

بے بے کو انگور کھٹے لگے تو کہنے لگیں۔

"چلو دیکھتے ہیں ایسے کون سے سُرخاب کے پر لگے ہیں اس چھوکری میں جو ساجدہ جیسی نخریلی اسے اپنی دیورانی بنا کے لارہی ہے۔"

اور وہاں جا کے انہیں سُرخاب کے وہ سارے پر نظر آگئے۔ وہ لمبا چوڑا جہیز، وہ نئی پجیرو، وہ پانچ سونے کے سیٹ، وہ لمبی چوڑی نقد سلامیاں۔۔۔۔ واپسی پہ وہ خاصی بجھی بجھی سی تھیں۔ بار بار فاطمہ، مہرالور نبیلہ کی طرف دیکھتیں اور سر و آہ بھر کے رہ جاتیں۔

دوسری طرف ماسی کی مہمان نوازی عروج پہ تھی۔ پہلے بھی بے بے کی کم آؤ بھگت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس بار بات ہی الگ تھی۔ اب وہ ماسی کی رشتے کی بہن نہیں رہی تھیں بلکہ اس سے کہیں بڑھ کے سمدھن بن چکی تھیں۔ بے بے کو بھی اپنے لڑکے کی ماں ہونے کے اسٹیٹس کا پورا پورا دھیان تھا۔ اس لیے۔ جھڑلے سے سارے حق وصول رہی تھیں۔ لیکن مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ایک یا دو نہیں پورے پانچ اضافی خرچے "اور دن میں دو دو بار ایسا پُر تکلف کھانا۔ کبھی پھل، کبھی کولڈ ڈرنک تو کبھی گھومنے پھرنے کے پروگرام بن رہے تھے۔ مجھے مامار حمت کی ساری آمدنی اسی پہ خرچ ہوتی نظر آرہی تھی اور یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔

باقی ساجدہ کی دیورانی کے جہیز کو دیکھ کے بے بے کو جس فکر نے گھیرا تھا وہ بھی بس وقتی احساس تھا۔ اگلے ہی دن انہوں نے اس تشویش سے چھٹکارا حاصل کرلیا کہ کیا کبھی وہ بھی اپنی بیٹیوں کو اس شان سے رخصت کرسکیں گی یا نہیں۔ اس کے بجائے انہوں نے اٹھتے بیٹھتے اس جہیز کی تعریفیں اور نئی دلہن کے ماں باپ کے بڑے دل کے قصیدے پڑھنے شروع کردیے۔

"واہ۔۔۔ لڑکی بیاہو تو اس شان سے بیاہو۔" کوئی تیسری بار انہوں نے سرد دھن کے کہا تو مجھ سے رہا نہ گیا۔

"ورنہ نہ بیاہو؟ ہے نا؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب جیسے ہم فاطمہ اور مہر کو نہیں بیاہ پارہے۔" میں نے آواز دبا کے کہا۔ وہ مجھے بری طرح گھورنے لگیں۔

"سوہرے بیٹھ کے جوائی کے تاثر جان جاتے ہیں یہ تو سنا تھا' مگر یہ پہلی بار دیکھا ہے کہ گھر جوائی سیریز کے ماں پہ دھاڑ رہا ہے۔"

"میں گھر داماد نہیں ہوں۔" مجھے شدید غصہ آیا۔ شکر ہے کہ بے بے کی سمع سے وقتی وقفے سے جاری کنیلی گفتگو سے گھبرا کے ماسی اندر جاچکی تھیں اور کوثر تو بے بے کے سامنے زیادہ آتی ہی نہیں تھی۔ پتہ نہیں شرم و جھجک کی وجہ سے یا پھر ان کی ایکسرے مشین جیسی نظروں سے خائف ہو کے۔"

"تیور تو تیرے وہی ہیں۔ میں کل سے دیکھ رہی ہوں ہر بات میں اعتراض کررہا ہے۔ بہنوں کے اٹھنے بیٹھنے پہ اعتراض' ان کے گھومنے پھرنے پہ اعتراض' ماں کے کھانے پینے پہ اعتراض' بڑا ہو رہا ہے کلیجے میں' اپنے سوہرے کی کمائی کا۔"

"آہستہ بولو بے بے۔ اور جب سے کمانا شروع کیا ہے مجھے محنت سے کمانے والے ہر بندے کی کمائی کا انتہائی درد ہوتا ہے۔ جہاں تک اعتراض کی بات ہے مجھے آپ کے کھانے پینے یا بہنوں کے تفریح کرنے پہ اعتراض نہیں۔ اگر وہ میرے خرچے سے ہو۔ مامار حمت اور ماسی کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے۔"

"ہم ان کے مہمان ہیں۔"

"مہمان ایک یا دو دن ہوتا ہے۔ آپ کو یہاں آئے ایک ہفتہ ہونے والا ہے۔ اپنا گھر یا رانے دنوں کے لیے چھوڑنا کوئی تک کی بات ہے؟"

"میں ابھی چلی جاتی ہوں۔" بے بے فوراً کھڑی ہوگئیں اور کھونٹی پہ لٹکا اپنا نوپلی رقعہ اتار کے پہننے لگیں۔

"کتنی چھچھ رہی ہے ماں۔۔۔۔ میں بھی کہوں میرے آتے ہی منہ کیوں بن گیا ہے' ہاں ہاں۔۔۔ اب وہ آزادیاں کہاں؟ سارا دن اس سڑیل کے ساتھ ہنسی ٹھٹھول اور آنکھ مٹکا چلتا ہوگا میرے آنے سے تو پابند ہوگیا ہے اس لیے مجھے بھیجنا چاہ رہا ہے۔"

"بے بے۔۔۔ بے بے۔۔۔ خدا کا خوف کرو۔" میں اس کھلے بہتان پہ تڑپ گیا۔ شدید غصے میں بھی مجھے اس بات کی پروا تھی کہ بے بے کی آواز کمرے سے باہر نہ جارہی ہو۔

"کوثر ایک شریف لڑکی ہے اور نہ ہی ماسی کے گھر کے ماحول میں ایسی خرابی ہے جو یہ سب کیا جاسکے۔"

"ہاں کوثر شریف' اس کی ماں شریف' ایک میں ہی بدمعاش ہوں۔" وہ سر پہ ہاتھ رکھ کے رونے لگیں۔ نئی مصیبت۔

"نی فاطمہ' نی مہرے۔ چلونی ساریاں' سامان باندھو' اپنے گھر چلو۔"

"بے بے تماشا نہ لگوائیں۔" میں نے ان کا برقعہ اتار کے دوبارہ ٹانگا اور شانوں سے تھام کے دوبارہ بٹھایا۔ اب میرے اندر میں خوشامد اور التجا تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بے بے کے اس طرح مشتعل ہو کے جانے سے ماسی کا دل برا ہو۔ ان کے اتنے دنوں کی مہمان نوازی پہ پانی پھر جانا تھا۔

"میں کل خود چھوڑ کے آؤں گا۔ دو چھٹیاں بھی لے لوں گا۔ اور واپس آکے اپنے لیے کرائے کا مکان بھی تلاش کرنا شروع کروں گا' پھر آپ اور بہنیں شوق سے آنا اور میرے اپنے گھر میں پورے حق کے ساتھ رہنا۔ تب میں نے کسی بات پہ کوئی اعتراض کیا پھر کہنا۔"

"پاگل ہوا ہے؟" بے بے کا سارا غصہ رفو چکر ہوگیا۔ اب ان کے چہرے پہ بے پناہ تشویش تھی۔

"کتنی تنخواہ ہے تیری جو کرائے پہ مکان لے کر رہے گا۔ کرائے پہ جو رقم جھونکے گا گیا وہ تیری بہن کے کام نہیں آسکتی۔ بیٹھا رہ آرام سے ادھر یہاں تجھے کیا تکلیف ہے؟"

"اور وہ جو گھر جوائی والا طعنہ۔"

"غصے میں منہ سے نکل گیا تھا۔ اب کیا تُو اس کے پیچھے اپنی تنخواہ برباد کرے گا۔ اپنا گھر بار اتنے دنوں کے لیے چھوڑنا کوئی تک کی بات ہے۔

"فیر حیدر! چلنا ہے کل میرے ساتھ؟ تو کہہ رہا تھا نا کہ دو چھٹیاں لے کر میرے ساتھ چلے گا، ہمیں چھوڑنے۔"

"کل؟ کیا آپ واقعی کل جارہی ہیں؟" مجھے حیرت تھی کہ کیا بے بے نے واقعی میری باتوں کو سنجیدگی سے لیا ہے یا آنا" ٹالنا" یہ واپسی کا پروگرام بنانے کی کوئی وجہ ہے۔

ماسی بتولاں نے بھی مزید رکنے پہ واجبی سا اصرار کیا۔ اگلے دن صبح جب میں بے بے اور بہنوں کے ساتھ نکل رہا تھا تو انہوں نے فس کر خود ہی کہا۔

"سوچ رہی ہوں' اگلے ہفتے۔ میں بھی ڈونگے بونگے آؤں۔ بھئی رسم جو بھلانی ہوئی۔ اب حیدر بخشاں میرا پتر ہے۔ اس کے لیے کوئی شگن وغیرہ تو لانا ہوگا۔"

اگرچہ بے بے اس بار بھی آتے ہوئے' شگن کے نام پہ کوثر کے لیے دھتی تک نہیں لائی تھیں۔ پھر بھی ماسی کسی رسم کو نبھانے کی بات کررہی تھیں۔ بے بے کی خاموشی اور کھری ہوگئی۔ ان کے آنے کی بات پہ جب دوسری جانب سے کوئی خیر مقدمی کلمہ یا حوصلہ افزائی نہیں کی گئی تو وہ بے چاری بھی چپ ہوگئیں۔

بے بے کی خاموشی اور اچانک واپسی کا راز اپنے گھر جا کر کھلا۔

☆ ☆ ☆

میں دو چھٹیاں لے کر اپنے گھر گیا تھا۔ تیسرے دن اتوار تھا' یعنی ایک اور چھٹی مگر میں بمشکل ایک ہی دن وہاں ٹک سکا۔ نہ بے بے میرا موقف سننے پہ تیار تھیں' نہ ہی میں ان کا مطالبہ ماننے پہ راضی' جب دونوں میں سے ایک بھی اپنی ضد سے ہٹنے پہ تیار نہ ہو تو انہوں میں خود بخود ایک تنی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی تلخی سے نجات پانے کے لیے میں لاہور واپس آگیا۔ وہاں پیدا ہونے والی بدمزگی کے اثرات میرے چہرے پہ رقم تھے۔

"خیر تو ہے حیدر بخشاں۔" ماسی نے میری چپ بھانپ کر کچھ خوفزدہ انداز میں پوچھا۔ یہ خوف انہیں بے بے کے تیور دیکھتے ہی لاحق ہو گیا تھا۔

"جی ماسی' سب خیر ہے۔"

"تو پھر منہ کیوں اترا ہوا ہے؟"

"اچھا ہے نا' چڑھا ہوا منہ بھی کوئی دیکھنے والا ہوتا ہے۔" فوزیہ نے اپنی عقل کے مطابق میرا دفاع کیا۔ میرے لبوں پہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔

"میں نے سوچا ہے نا' تم آؤ تو میں ایک چکر لگالوں تمہاری طرف کا۔ یہاں نہ سہی' برادری میں تو بات نکال دینی چاہیے۔ یہ گرمیاں گزر جائیں۔ ٹھنڈے مہینے کی کوئی تاریخ بھی رکھ لیں گے۔"

"نہیں ماسی۔" میں گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ ہکا بکا مجھے دیکھنے لگیں۔ میں نے جلدی سے اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے اور بات بدلی۔

"میرا مطلب ہے' ابھی وہاں نہ جانا۔ بہت گرمی ہے' اتنی گرمی میں بسوں کا سفر۔ میری طبیعت بھی تو اسی وجہ سے خراب ہے اور آپ کو چپ چپ اور اداس لگ رہا ہوں دراصل سفر کی گرمی نے اندر سے کھوکھلے کر کے رکھ دیا ہے۔ بے بے بھی جاتے ہی بیمار پڑ گئیں۔"

"ہیں؟ رمکاں بیمار ہوگئی؟ پہلے بتانا تھا۔ میں خیریت پوچھنے کا فون ہی کرلیتی۔ کیا سوچتی ہوگی وہ..... فی فوزیہ' اندر سے فون تو اٹھا کے لا۔"

"وہ ماسی..... کوئی فائدہ نہیں فون کرنے کا۔" میں سخت جز بز ہو رہا تھا۔ جتنی کوشش کر رہا تھا' نہیں بے بے سے بات کرنے سے باز رکھنے کی۔ اتنا ہی وہ تلی بیٹھی تھیں۔

"فون والے ہمارے چھٹیاں گزارنے ہماہلپور گئے ہوئے ہیں۔" بروقت بہانہ سوجھ گیا۔

"ہائے ہائے' یہ بڑی مصیبت ہے۔ تُواں کو فون کیوں نہیں ملّو اوتا؟" اب یہ ایک نئی بحث چھڑنے جارہی تھی جس سے گھبرا کے میں نے گفتگو کی فکر کی۔

"کہاں جارہے ہو بھائی حیدر؟" باجی ساجدہ کا سر کبھی ایک دیوار سے آلگا۔ پہلے میں اچھا بھلا سادہ سا حیدر ہوا کرتا تھا۔ آج انہوں نے بھائی کا تڑکا لگا کے زیادہ ہی انیائیت جتانی چاہی اور میں اس نئی نئی پیدا شدہ انیائیت کے سارے اسباب جانتا تھا۔ اس لیے خاص ردِّ عمل ظاہر نہ کیا۔ روکھا سامنہ بنا کے جواب دیا۔

"تمہارے بھائی قسم سے بڑا اداس ہو رہے تھے۔"

"میں بھائیوں سے کل کے ہی آرہا ہوں۔"

"ایں.....؟ نہیں وہ بھائی نہیں۔ تمہارے یہ والے بھائی۔" اب کے ذرا شرما کے کہا گیا۔

وہ کہہ رہے تھے کہ حیدر بہت دنوں سے ملنے نہیں آیا۔ اس محلے میں ایک تم تو پڑھے لکھے اور سمجھ دار بندے ہو۔ تم سے ہی ان کی بنتی ہے۔"

"اور میری اس محلے میں سب سے زیادہ چاچے نیم پاس سے بنتی ہے۔" میں نے انہیں کلسانا چاہا۔ بے بے کے دماغ میں جو کیڑا کلبلانے کے لیے انہوں نے چھوڑا تھا۔ اس جرم کی پاداش میں' میں ان کے ساتھ جو بھی کرتا وہ کم تھا۔

"دفع..... وہ بھی کوئی بندہ ہے۔ خسروں کا دارو غہ۔ تمہارے بھائی نے آج صاف کہہ دیا ہے اسے کہ اپنے کرائے دار اتنے لاڈلے ہیں تو طریقے سے رکھو انہیں۔ ان کے آنے جانے کے لیے پچھلا دروازہ استعمال کراؤ۔ خبردار جو ہمارے ہاں سے ڈھولک اٹھائے گزرتے نظر آئیں تو....."

میرے نکلتے نکلتے بھی انہوں نے معلومات میں اضافہ کیا۔ مگر میں نے رکنا گوارا نہ کیا۔ انہوں نے حرکت ہی ایسی کی تھی۔ بے بے کو اپنی بہن کا لاڈ اٹھانا تھا۔

"میں کم عقل' جلد باز' جاہل۔ کتنی جلدی کی میں نے فیصلہ کرنے میں۔ اور جلدی کا کام تو ہوتا ہی شیطان کا ہے۔"

مجھے بے بے کی ساری باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں۔

"مجھے تو لگتا ہے بتولاں نے گھر کی چوکھٹ میں کوئی تعویذ دبا کے رکھے ہیں۔ اندر جاتے ہی بندے کا دماغ چوپٹ ہو جاتا ہے۔ جیسے تجھے وہاں جاتے ہی ہوا لگ گئی۔ ایسے ہی میری بھی عقل ماری گئی۔ ادھر گئے دو گھنٹے ہوئے نہیں کہ میں نے لڑکی کا رشتہ مانگ لیا۔ بھئی بڑے شگنے تعویذ ہیں۔ کوئی پہنچا ہوا بابا پکڑا ہے بتولاں نے۔ لیکن میں بھی ڈھیٹ مٹی ہوں۔ کالے سے کالا تعویذ بھی مجھے زیادہ دیر تک دبا نہیں سکتا۔ آخر مجھے ہوش آ ہی گیا۔ اور یہ ہوش مجھے ساجدہ نے دلایا۔"

"کیا سگھڑاپا انہوں نے؟" میں نے بے دلی سے پوچھا۔

"سگھڑاپا نہیں' کُھلڑاپا۔ اپنی بھتیجی' بہن دکھائی ہے۔ اتنی سوہنی' اونچی لمبی جوان لڑکی۔ دیکھ کے پتہ چلتا ہے کہ کسی کھاتے پیتے گھر کی ہے۔ اس کوثر کی طرح ہڈیوں کی مٹھ نہیں ہے۔"

"جیسی بھی ہے' ہمارا کیا لینا دینا باجی ساجدہ کی بہن کے۔" خطرے کی گھنٹی کہیں اس پاس اسی وقت بجی تھی لیکن میں نے نظر انداز کرنا چاہا تھا۔

"یہیں تو ہوگا سارا لینا دینا۔" انہوں نے "وہ مارا" کے انداز میں لہو بلند کیا۔

"وہ بتولاں' کیا دے گی تو لے گا لی۔ ساجدہ نے اپنے منہ سے تیرے لیے بات کی ہے۔ اور ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ اس کے باپ نے اپنی اس آخری بیٹی کو پہلی بیٹیوں سے بڑھ کے جہیز دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور جہیز بھی کوئی ایسا ویسا نہیں۔ اس کی دیورانی کے مقابلے کا۔ بارات بھی وہ کسی اچھے ہوٹل میں ٹھہرائیں گے اور کھانا....."

"بس کر دو بے بے..... یہ کوئی مذاق ہے یا گڈی گڈے کا کھیل۔"

"زیادہ اوکھا نہ بول' ماں ہوں میں تیری۔ جدھر میری مرضی ہوگی ادھر ہی تیرا رشتہ کروں گی۔"

"پہلے بھی میں نے آپ کی مرضی پہ سر جُھکایا تھا' لیکن اگر آپ کی مرضی آئے دن یونہی بدتہ رہے گی تو میں ہرگز ایسا نہیں کر سکتا۔"

"کیوں نہیں کر سکتا؟ ڈوا اپنی مرضی چلانے والا' اگر اپنی مرضی کی وہٹی لانی ہے تو خود شادی کرنا۔ دیکھتی ہوں بغیر ماں باپ کے کون شریف زادی تیرے ساتھ آنے پہ راضی ہوتی ہے۔ جو چھڑے چھانٹ کو جوائی بنائے گا وہ سب سے پہلا زنبیل' پھر اپنی نوکے لوکے کران ہی پنج لوگوں کے ساتھ رہنا۔ ہمیں نہیں چاہیے وہ سوہنا۔ جس سے نہ کوئی فائدہ نہ سواد' اگر ماں کو خوش کرنے رب راضی کرنا ہے تو پھر ساجدہ کی بہن سے شادی کرلی ہوگی۔"

"پتہ نہیں ایسے رب راضی ہو گا یا قبر ٹوٹے گا کوئی..... میں کوئی دلی تو نہیں ہے بے بے! نہ ہی کوئی نیک نمازی بندہ' لیکن اتنا احساس ضرور ہے کہ کسی کا دل توڑنا اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ فعل ہے۔ کسی کو امید لگانا۔ آس دلانا اور پھر ایک جھٹکے سے' نہیں بے بے! یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔"

کوثر کی صورت نظروں کے سامنے پھرنے لگی اور ماسی کی محبت یاد آئی تو میں بے بس پڑ گیا۔ لیکن بے بے میرا کوئی بھی عذر سننے پہ تیار نہیں تھیں۔

"کوئی نکاح نہیں ہو رہا تجھ سے نکے اور ان کو کیا فرق پڑتا ہے۔ انہوں نے مفتی کی خبر ہوا کو نہیں ہونے دی۔ کون سا لڑکی کی بدنامی ہو چلی ہے جو ہم سوچتے بیٹھیں۔"

"ہاں اس زمانی کلامی کی خبر تو کسی کو نہیں۔ لیکن مجھے..... مجھے تو پتا ہے' کوثر کو تو پتہ ہے۔ کاش ہمیں بھی پتہ نہ چلتا اور ہم بھی اگر خوبصورت رشتے سے بے خبر اور انجان رہتے۔ تب واپس پلٹنا کتنا آسان ہوتا۔ یوں تو محسوس نہ ہوتا جیسے اب ہو رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے واپسی کے رستے

پہ کرچیاں ہی کرچیاں بکھری ہوں۔"

میں بال مٹھیوں میں بھینچے سوچتا رہا۔ بے بے نے مجھے مہلت دی۔

"اچھی طرح سوچ لے' میں کوئی تیری دشمن نہیں' نہ تیرے ساتھ زور زبردستی کرسکتی ہوں۔ کوثر سے شادی کرے گا تو اگلے ہی سال تک بیوی اور اولاد کے خرچے پورے کرنے کے ساتھ ساتھ ہم چار جانوں کی ذمہ داریاں بھی پوری کرنی پڑیں گی۔ بہنوں کے فرض سے ہلکا ہوگا تو تیری اپنی اولاد جوان کھڑی ہوگی۔ ساجدہ کی بہن سے کرے گا تو کاروبار شروع کرنے کے لیے پیسہ ملے گا۔ بہنوں کی شادی کے لیے مدد ملے گی۔ اولاد بھی اچھی طرح پل جائی گی۔ اگر نانکے (ننھیال) کھاتے پیتے ہوں۔ ہر مہینے پہ بنی' اور اس کی اولاد کو دیتے دلاتے ہیں۔ جیز اتنا کہ گھر بھر جائے گا۔ ساری زندگی اپنے گھر کے لیے کچھ خریدنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ فیصلہ تیرے ہاتھ ہیں ہے۔ اچھی طرح سوچ لے۔"

اور میں اس وقت سے یہی سوچ رہا تھا۔ اسی سوچ نے مجھے الجھا یا ہوا تھا۔ میری الجھن یہ نہیں تھی کہ میں کوثر اور باجی ساجدہ کی بہن میں سے کسی کا انتخاب کروں۔ اس سلسلے میں میرا ذہن بے حد واضح تھا اور میرے دل کا بھی بھی۔ مشکل یہ تھی کہ بے بے کو کیسے رضامند کروں۔ باجی ساجدہ نے ان کی بس حرص کو بھڑکا دیا تھا اسے دھیما کیسے کروں۔ ان کی مرضی کے خلاف جانا بھی میرے لیے ناممکن تھا اور ان کی ناں کو ہاں میں بدلنا بھی مشکل ترین تھا۔

☆ ☆ ☆

"کی گل اے شنڑاوے' پڑا بھجا بیٹھا ہے۔"

چاچے کے پاس ہونی اٹھ کے چل دیا تھا۔ شاید باجی ساجدہ سے جان چھڑانے کے لیے اور اب وہاں بھی اکھڑا اکھڑا سا بیٹھا تھا۔ میری بے سکونی ان کی نظروں سے بھی چھپ نہ سکی۔

"ساری بتیاں ہا' اکھل ہوگئی ہیں۔" میں نے اپنی بے بسی کا مذاق اڑایا۔

"خیر ہوئے بابو' یہ فیوز کس نے اڑایا؟" رانی کمرہی اپنا لہنگا سنبھالتا میرے ساتھ آ کے بیٹھا۔

"اوپر ماں ہٹ کے بیٹھے....." چاچے ٹھ پاس نے گھر کے کہا۔

"کیوں اپنے پیسنے کی بو سے بچے کو بھگانا ہے۔"

"رہنے دے چاچا..... جو تیری بو کا عادی ہو جائے' اسے پھر گندے نالے کی بو بھی نہیں کچھ کہتی۔ اور انجمن..... تو کدھر چلی؟" بات کرتے کرتے اس نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا' جو میلی سی دھوتی اور گہرے سبز کرتے میں ملبوس باہر نکل رہا تھا۔ آدھے گنجے سر والا یہ ہیجڑا فیئر وک' ٹیک اپ اور زنانہ لباس کے بہت الگ الگ محسوس ہوا۔

"کوئی رزق روٹی کا بندوبست کرنے۔" البتہ اس کی گفتگو کا انداز وہی تھا جو اس کے ساتھیوں کا۔

"اور کتنی بار کہا ہے مجھے اب انجمن نہ کہا کر۔ میرا نام اشرف ہے۔"

"چل اشرف ہی سہی..... تو بہن اشرف' ناں کہ اب تیرا ہی ناچنے گانے میں نہیں لگتا لیکن تو نے اتنے سال ہمیں ناچ کے کھلایا ہے۔ میں اور ملکہ تو اتنی اتنی سی ہوتی تھیں تو نے اور باجی نے مروٹے ہمارے بڑے چاؤ پورے کیے ہیں۔ ہماری تو ماں' باجی سب تم ہو۔ اب تمہاری عمر ہوگئی ہے۔ اشرف باجی تو کیا ہم لوگ اتنا بھی نہیں کرسکتے کہ تمہیں بٹھا کر کھلائیں۔ کہاں اب اس عمر میں جُل خوار ہوتی پھرو گی۔"

"کیوں نی؟ کتنی عمر ہوگئی ہے میری؟" رانی کی اس محبت کے جواب میں اشرف باجی نے کمر پہ ہاتھ رکھ کے تنک کر کہا۔

"اپنی سولہ سال کی جوانی کے خمار میں نہ رہنا۔ ہم خسروں کی عمر ہر سال نہیں چھلانگیں مارتی ہے۔ آج تو سولہ کی ہے اگلے سال بیس کی ہوگی۔ اور میرے بھی ہاتھ پیر سلامت ہیں۔ ان کے لیے جو ڈگر رکھ' جو جھے پیدا ہونے کے تین گھنٹے بعد ہی ہمارے ہتھے مار گیا تھا۔"

وہ فون فون کرتی باہر نکل گئی۔ یا نکل گیا۔ رانی کانوں کو ہاتھ لگانے لگی۔

"باجی انجمن تو بڑی کٹ کھنی ہوگئی ہے۔ ناں چاچا تو تنا میں نے کوئی ماڑی بات کی ہے۔"

لیکن چاچا ٹیم پاس کوئی جواب دینے کی بجائے بڑبڑانے لگا۔

"یہ تیری اشرف باجی پھر سانبنے کے دروازے سے نکل گئی ہے۔ سنا نہیں کہ وہ حیف کیا آرڈر دے کیا تھا کہ آج سے تم سارے پچھلی گلی والے دروازے سے باہر آؤ جاؤ گے۔"

"ناچاچا' یہ بڑا مشکل کام ہے۔" گرونے اندر سے آواز لگائی۔

"پچھلی گلی میں سارے مسٹنڈے چھڑے چھانٹ رہتے ہیں۔ ایک سے بڑھ کے ایک آوارہ' لوفر اور بدمعاش..... آتے جاتے میری بچیوں کو چھیڑیں گے۔ آوازیں کسیں گے یہ کام نہیں چلے گا۔ ہم نے جب یہ مکان کرائے پہ لیا تھا تو اسی دروازے سے اندر آئے تھے۔"

"اور پچھ کا پچھنا ہوں میں....." چاچا بھنا کے کھڑا ہوگیا۔

"زنانیاں رکھ لو تو یہ تحفے دار ہمیں چھینے دیتے۔ منڈے رکھ لو تو اعتراض کرتے ہیں کہ چھڑا کرائے دار کیوں رکھا ہے۔ دھی بہن والے تحفے میں اور اگر سارے رہیٹر مکانے کے لیے یہ کرائے دار رکھے ہیں تو ان لوگوں کو تکلیف ہے۔ اوپر سے یہ بھی اکڑ دکھارہے ہیں مجھے۔"

میں اپنا دھیان بٹانے یہاں آیا تھا' لیکن ادھر اپنی کل کل شروع ہوچکی تھی۔ آتا کے نکالا تو کل میں ہی پھاتھیف کے لڑکے کے ذمہ لیا۔

"آپ کو ابو لارہے ہیں۔"

میں شاید ادھر ادھر کھسک جاتا' مگر وہ سائے کی طرح ساتھ لگ کے مجھے اپنے ابو تک لے گیا۔ جو سرکاری نوکری کے مزے لوٹتے ہوئے چھٹی' منارے تھے اور اپنی بینک میں بیٹھے تیل لگوارہے اور پالش کروارہے تھے اور یہ خدمت انجام دینے والا کوئی اور نہیں' انجمن یا اشرف نامی ہیجڑا تھا۔

"ارے آؤیار' تم نے تو شکل دکھانی چھوڑ دی۔ آؤ بیٹھو' کیا چلے گا؟ گرمی سے شربت پی لو..... بلکہ بولو' منگواتا ہوں۔ لوئے جا' دو بوتلیں پکڑ کے لا۔"

میرے ناٹا کرنے کے باوجود انہوں نے مینے کو بھگایا۔

"آج تو پھر کا کھانا بھی میرے ساتھ ہی کھانا۔ تمہاری باجی نے کوفتے بنائے ہیں ساتھ میں کڑھی پکوڑا۔"

اب مجھے لگا کہ یقیناً" وہ اس غیر ضروری التفات کا مظاہرہ اپنی بیگم کی ہدایت پہ کررہے تھے۔ ورنہ ان کا تعلق کمپنی کے اس کروہ سے تھا جو کچھ کھارہے ہوں تو کسی کی آمد پہ نہ صرف پلیٹ پیچھے ہٹا لیتے ہیں' بلکہ منہ میں رکھا نوالہ چبانے کی بجائے ثابت نگل جاتے ہیں۔

"جی نہیں شکریہ' میں دوپہر کا کھانا نہیں کھاتا' آپ نے کسی کام سے بلایا تھا مجھے۔"

میں نے اپنا رویہ جان بوجھ کے روکھا پھیکا رکھا تاکہ وہ کسی خوش فہمی میں نہ رہیں۔

"کیوں بھئی' اس جوان عمری میں دوپہر کا کھانا کیوں چھوڑ دیا؟ یہ اپنے سلیم کو ہی دیکھو۔" انہوں نے اپنے بھائی کا نام لیا۔

"شادی کو دس دن ہوگئے ہیں' ابھی تک ناشتہ اس کے سسرال سے آتا ہے۔ حلوہ پوری' نہاری' مرغ چنے' پیڑوں والی کھی' ہم سارے پیٹ بھر کے کھاتے ہیں اور دوپہر کو پھر سے بھوک لگ جاتی ہے۔"

"خیریت ہے؟ یہ ناشتہ سلیم کی سسرال سے کیوں آتا ہے؟ کیا باجی ساجدہ ناشتہ بنانا بھول گئی ہیں؟" میں نے تھکے پن سے پوچھا۔

"جی نہیں' یہی تو وقت ہے سسرال والوں سے نخرے اٹھوانے کا۔ میرا ناشتہ ایک مہینے تک آیا تھا۔" انہوں نے فخریہ بیان کیا۔

"بھئی میرے سسرال والوں کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ جتنی عزت وہ داماد کی کرتے ہیں۔ بتا خیال وہ بیاہی بیٹیوں کا کرتے ہیں کوئی اور نہیں کرسکتا۔"

اب میرا شک یقین میں بدل گیا۔ وہ یقیناً" اپنی بیگم کے کہنے پہ ہی میری منی نرم کررہے تھے۔ مجھے اپنی سسرال کی جانب راغب کرنے کی کوشش کررہے تھے۔

"لوگ ٹڑیاں لگاتے۔ سسرال والوں سے مال بٹورتے ہیں۔ مجھے اللہ کے فضل سے آج تک ٹڑی لگانے یا بیوی کو بھکا دے کر سسرال بھیجنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ اتنے بھلے لوگ ہیں کہ بھی اس کی نوبت ہی نہیں آنے دی۔ یہ ٹیس نہاکا کرا دیکھ رہے ہو۔ ایسے چار کرتے ہر سال گرمیوں میں کڑھ کے آتے ہیں۔ چنیر مین لوہنے کے شلوار سوٹ سِل کے آتے ہیں۔ سردیوں کے گرم کپڑے الگ بنی اور نواسوں کو جو دیتے ہیں وہ الگ۔ جبھی ان کا داماد خرچے اور منگائی کی فکروں پریشانیوں سے جنتا دور ہوگا۔ ان کی بیٹی کو اتنا ہی خوش رکھ سگے گا ناں۔ جو بندے سارے دن کھپ جاتے ہیں' گھر آکے بیوی بچوں سے کیا خاک میٹھی بات کریں گے۔"

میں بے رغبتی سے سر ہلا تا رہا۔

"سلیم کی مثال لو۔ ہاں بڑا کھلا جیز دیا انہوں نے مگر یہ کتنے سال کام آتا ہے۔ سسرال والے وہی اچھے جو عمر بھر ناتہ جڑے رہیں۔ تمہیں نہیں پتا' شادی کے بعد میں

نے ڈیڑھ سال بے روزگاری کا بھی کاٹا ہے۔ دو بچے بھی تھے تب۔ میرے سسرال والوں نے ذرا پتہ نہ چلنے دیا کہ میرے پاس کوئی کام نہیں۔ جیب میری تب بھی بھری رہتی تھی۔ ہفتے کے ہفتے میرا سسر آ کے فریج پھلوں اور گوشت سے اور الماری اناج اور دوسرے سامان سے بھر دیتا تھا۔ یہ نوکری بھی بڑے سالے نے لگوائی۔ کوئی ڈھائی لاکھ روپے کی رشوت اور خاصی تگڑی سفارش لگا کر' بڑا لڑکا میٹرک کرلے.... اسے کالج میں پڑھانے کی ذمہ داری بھی اس کے نانا نے لی ہے۔ میں تو اس دن اپنی ساس کو سنا آیا تھا کہ اب آپ کی ایک ہی بیٹی بیاہنے والی رہ گئی ہے۔ اسے رخصت کر کے مطمئن ہو کے نہ بیٹھیں۔ اس کے بعد اپنی نواسیوں کے لیے سوچیں۔ ان کے لیے جوڑ کے رکھیں۔ ان کے جہیز کی فکر کریں۔"

"مگر وہ آپ کی بیٹیاں ہیں۔ آپ کی ذمہ داری آپ کا بھی تو فرض بنتا ہے کہ۔"

"فرض ان کا بھی بنتا ہے آخر وہ نانا ہیں' ماموں ہیں' او کم عقل انسان' ٹکڑے سسرالیوں کا یہی فائدہ ہوتا ہے۔ اگر ان کے پاس کچھ ہے تو نچوڑتے رہو۔ آخر وقت تک نچوڑتے رہو۔"

ان کے زریں خیالات سن کر میرا دل کچھ اور کھٹا ہو گیا لیکن میں چپ رہا۔ میری خاموشی کو شاید وہ کچھ اور سمجھے کہ میں بڑا متاثر ہو رہا ہوں۔ میرے کاندھے پہ زور کی دھپ لگائی۔

"اب عقل میں آئی ناں میری بات؟ یہ لے اشرف' یہ تیرے بیس روپے۔" انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے ایک نوٹ نکالا اور اس ہیجڑے کی طرف بڑھا دیا جس کے چہرے کے تاثرات میرے چہرے کے تاثرات سے بھی زیادہ کڑوے ہو رہے تھے۔

"شکر ہے' مزدوری ابھی مل گئی ورنہ میں تو سمجھی۔ یہ بھی اپنے سسر سے لا کر دو گے۔"

اس کے اس طعنے پہ میں نے اپنی مسکراہٹ اور بھا حنیف نے اپنے غصے پہ بڑی مشکل سے کنٹرول کیا۔

"زیادہ بک بک نہ کر' ایک تو ترس کھا کے تجھے یہ کام دیا۔ اس پہ بڑبڑ کرتا ہے۔ میں نے مالش کروانی شروع کی ہے تو دوسرے لوگوں نے بھی تجھے کام دینا شروع کیا ہے۔ ورنہ کوئی ہاتھ نہ لگانے دے۔ اور بات سن' تیری بات اور ہے لیکن اپنے ان دوسرے ساتھیوں کو کہہ دے۔ خبردار جو اس گلی میں قدم رکھا تو.... ٹانگ تڑوا دوں گا۔ پچھلی طرف سے آنا جانا رکھو۔"

"کیوں؟" اشرف نے کاندھے پہ رکھا رومال دوپٹے کی طرح گلے میں ڈالا اور لڑاکا ہمسائیوں کی طرح کمر پہ ہاتھ رکھ کے پوچھنے لگا۔

"اس لیے کہ ہم ہیجڑے ہیں۔ خسرے ہیں' اور تم تمہارا بھائی اور یہ باقی سارے مرد ہیں؟ ڈوب مرو' خسرے تم لوگ ہو جو اپنے ہاتھ پیر ہوتے ہوئے بھی دوسروں کی آس اور مدد پہ زندہ ہو۔ تم نامردوں سے ہم بھلے جو اپنی روٹی اپنے ہل بوتے پہ تو کماتے ہیں۔ مجھے دیکھو.... گردے کا آپریشن ہوا' ہرنیا کا ہوا.... اب سلے ہوئے پیٹ کے ساتھ ناچ گانا نہیں کر سکتی۔ لیکن بیٹھ کے مفت کی روٹی توڑنا گوارا نہیں مجھے۔ تم جیسے ہڈ حراموں کی مالش کر کے اور مٹھی چاپی کر کے دس دس' بیس بیس روپے کماتی ہوں تاکہ روٹی کھانے کا سواد تو آئے۔ میری ساتھی سہیلیاں اور گرو اتنے بے فیض نہیں کہ مجھے روٹی نہ کھلا سکیں۔ لیکن کیا کروں۔ ہیجڑا ہوں اس کے باوجود غیرت مر نہیں سکی۔ مفت کے نوالے کا سواد ہی نہیں آتا اور' اور بغیر سواد کے تو تر نوالہ بھی اندر جائے تو کیا فیدہ۔"

اچانک اس نے اپنے مخصوص انداز میں زوردار آواز کے ساتھ تالی بجائی۔

"ہم تو اسی گلی میں سے نکلیں گے۔ گردن اٹھا کے نکلیں گے۔ منہ چھپا کے تم اندر بیٹھو۔ سسر کی کمائی پہ پلنے والے نامرد تو تیرا بھائی اور تیرے جیسے دوسرے مفت خورے' بھیک منگے مل کے ٹولی بنا لو' جیسی ہماری ہے۔"

اس کے بعد جو بھا حنیف کے منہ سے گالیوں کا طوفان نکلا' اشرف کو وہاں سے بدعائیں دیتے ہوئے بھاگنا ہی پڑا' لیکن اس کے جانے کے بعد بھی وہ مجھ سے نظر نہ ملا سکے۔

"اگر اشرف کے مشورے پہ عمل کرتے ہوئے آپ کا اس قسم کی ٹولی بنانے کا ارادہ ہے بھی تو مجھے معاف رکھیں۔ میں اس صف میں شامل نہیں ہونا چاہتا' جہاں کھڑے ہو کر مجھے اپنی ہی اولاد کے سامنے سر جھکانا پڑے۔"

میری بات پہ انہوں نے پلٹ کے دیکھا۔ بیٹھک کے دروازے پہ ان کے بچے لائن بنا کے کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔

"غور سے دیکھیں بھا حنیف! ان میں آپ کی تین

بیٹیاں ہیں۔ رسم ڈالنا بہت آسان ہے اسے نبھانا مشکل' آپ نے داماد بنانے والی رسم ڈال تو لی' آپ کے سسر صاحب جائیداد اور خوشحال ہیں' انہوں نے تین تین داماد گود لے کر یہ رسم مقدور بھر نبھا بھی دی۔ لیکن کیا آپ ایک داماد بھی افورڈ کر سکیں گے اور وہ بھی اپنے جیسا۔"

انہیں سوچنے کے لیے ایک سوال دے کر جب میں وہاں سے نکلا تو میرے اپنے پاس سوچنے کے لیے اب کچھ نہیں رہا تھا۔

میں بالکل ہلکا پھلکا ہو رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کڑکڑ کڑکڑ..... کڑکڑ....."

حسب معمول میری آنکھ مرغیوں کے اس شور سے کھلی۔ اب یہ آواز اور بھی نزدیک سے آتی ہے۔ صرف آواز ہی کیوں..... اگر اٹھنے میں دیر ہو جائے تو میری زوجہ محترمہ ایک عدد مرغی اٹھا کے میرے بستر پہ چھوڑ دیتی ہیں۔ جو ٹھونگیں مار مار کے بالآخر مجھے چھٹانک مار کے اترنے پہ مجبور کر ہی دیتا ہے۔

"کبھی محبوباؤں کی طرح بھی جگایا کرو ظالم۔" مرغی کی مسلسل چونچ بازی سے تنگ آ کے میں اٹھ بیٹھا اور ایک بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے شکوہ کیا۔

"مثلاً" کیسے؟" کوثر نے جھاڑو پھیرتے پھیرتے رک کے مجھے تیکھی چتون کے ساتھ گھورا۔

"اوں..... مثلاً" میں آنکھیں میچ کر سوچنے کی ایکٹنگ کرنے لگا کہ اچانک اندر سے چاچا نیم پاس کا ٹیپ ریکارڈر بج اٹھا اور میری مشکل آسان کی۔

"اک پنچھی موتیے دا مار کے جگا سوہنیے۔"

"ہاں' ایسے..... ایسے جگاؤ مجھے۔"

"موتیے کا پھول لے تو سہی..... یہاں تو نرے نیم کے نیم بسے ہیں۔ ہلکا سا بھی مارا تو ہائے ہائے کرتے رہو گے۔ آدھا گھنٹہ۔"

وہ ایسے بولی جیسے نیم کی نمبولی ہی تو چبا کے بیٹھی ہو۔

"سب ماحول کا اثر ہے۔" میں بڑبڑاتے ہوئے اٹھا اور تنقیدی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ واقعی اس ماحول میں بھلا کون رومانویت جھاڑے گا۔

وہی جھاڑ جھنکاڑ سے بد شکل پودے۔ وہی گندے پانی کا حوض' جس میں تیرتی بھدی آوازوں والی بطخیں۔ وہی منحوس باتیں کرنے والا مکار طوطا۔ اور وہی نامعقول گدھا۔ شکر ہے کہ وہ خارش زدہ کتا کوثر پروین نے یہاں آنے سے پہلے ہی مار بھگایا۔ اگرچہ وہ بھی چاچا نیم پاس کا کوئی کم لاڈلا نہیں تھا' لیکن کوثر کی شرط ہی یہی تھی کہ جس گھر میں کتا نجاست اور نحوست پھیلاتا ہو وہ وہاں نہیں رہے گی۔ کاش کتے کی طرح یہ گدھا بھی نجس اور مکروہ ہوتا۔

"ان بے کار جانوروں کے علاوہ اب کوئی خاص قابل اعتراض بات نہ رہی تھی اس گھر میں۔ چاچے نے زندگی میں پہلی بار ہمارے آنے کے اہتمام میں جب ڈسٹمل کرتے ہوئے ان بے رنگ دروغن دیواروں' دروازوں اور کھڑکیوں پہ قلعی کروائی تھی۔ اکھڑا ہوا فرش ہموار کرایا تھا۔ باقی کسر کوثر کی صفائی' ستھرائی کی عادت اور سلیقے نے پوری کر دی ورنہ جب میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کر لیا تھا تب اپنے ہی اس جلد بازی میں کیے فیصلے پہ میں نے خود کو جی بھر کے کوسا تھا۔ شکر ہے صورِ حال اتنی خوفناک نہیں رہی' جس کا خدشہ تھا۔ اس بد گدھے کا بچہ..... یہ چاچے نیم پاس کی ناک والا طوطا اور یہ مرغیاں' یہ بھی کہیں غائب ہو جاتیں تو مزہ آ جائے۔

"آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اشرف اور رانی کی پارٹی کو نکال کر میں نے چاچے نیم پاس کے گھر پہ قبضہ کیا اور وہ بھی کوثر کے ساتھ؟ ہیجڑوں کی اس ٹولی کا یہاں سے جانے کا فیصلہ اپنا تھا اور چاچا نیم پیس جس کا اس عمر میں اکیلے گزارا نہیں ہو تا تھا۔ سخت پریشان۔ کہ اب کہاں سے بنا کرائے دار ڈھونڈے۔ ایسے میں ایک دن اس نے میرے سامنے کہہ ڈالا۔

"اب تو آدھے کرائے پہ بھی کوئی ڈھنگ کا بندہ ملا تو رکھ لوں گا۔"

"آدھا کرایہ؟"

"ہاں..... بے شک ہزار ہی دے دے' لیکن تین جماز جتنے کمروں میں اکیلے نہیں رہا جاتا۔ میں مر گیا تو شاید چار دن بعد میری بدبو سے ہی محلے والوں کو میری موت کا پتہ چلے گا۔"

اس نے خاصی رقت کے ساتھ کہا مگر میرا دل موم ہونے کی بجائے خباثت سے مسکرا اٹھا۔

"مشکل ہی ہے۔ چار دن بعد بھی شاید ہی کسی کو پتہ چلے۔ کیونکہ یہاں سے گزرتے ہوئے پہلے ہی سب ناک پہ رومال رکھ لیتے ہیں۔"

"مخول کرتا ہے..... خدا کسی کو بڈھے ویلے اکیلا نہ کرے۔"

"آمین..... اور چاچا فکر مت کرو۔ تم بھی اکیلے نہیں رہو گے۔ بس اپنی اس بات پہ قائم رہنا۔ یعنی ایک ہزار روپے کرائے والی بات۔" میں نے جھٹ موقع سے فائدہ اٹھایا۔

میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ شادی کی تاریخ مقرر ہوتے ہی میں یہاں اٹھ آؤں گا اور کوثر کو بھی رخصت کرا کے یہیں لاؤں گا۔ میرے اس فیصلے کی سب سے زیادہ مخالفت بابی نے کی۔ وہ میرے یہاں رہنے کے حق میں نہیں تھیں۔ ماما رحمت نے بھی اسی خواہش کا اظہار کیا کہ میں شادی کے بعد بھی یہاں' ان ہی کے گھر میں رہوں۔ گھر داماد بن کے نہیں بلکہ اس وقت تک جب تک کہ میں کسی اچھے اور معقول مکان کو کرائے پہ لینے کی پوزیشن میں نہیں آ جاتا۔ میں جانتا تھا کہ ایسا بہت جلد ہو جائے گا۔ کیونکہ میں جہاں ملازمت کر رہا تھا وہ لوگ محنت اور قابلیت کی قدر کرنے والے تھے۔ میری ترقی ہو چکی تھی اور مزید کی مسلسل امکان تھا۔ پھر بھی میں ایک دن بھی گھر داماد کی حیثیت سے رہنے پہ تیار نہیں تھا۔

اشرف کا وہ طعنہ جو اس نے بھاحنیف کو دیا تھا۔ پتہ نہیں اس پہ اثر کر پایا یا نہیں' مگر مجھے تازیانے کی طرح لگا تھا۔ میں آج بھی اس بد مزاج اور بد زبان ہیجڑے کا مشکور ہوں۔ جس نے بروقت مجھے سنبھلنے میں مدد دی۔ ورنہ شاید وہ ذہنی کشمکش مجھے کوئی غلط فیصلہ کرنے پہ مجبور کر دیتی۔ کوئی "بیا غلط فیصلہ..... جس کے نتیجے میں آج سے دس سال بعد مجھے بھی اپنی اولاد کے سامنے شرمندگی سے سر جھکانا پڑتا۔

میں نے اسی وقت "مرد" بننے کا فیصلہ کر لیا تھا' اور مردانہ وار ساری صورِ حال کو ہاتھ میں لینے کا ارادہ بھی' بے بے کو ان دلیلوں کے ذریعے رضامند کرنا مشکل تھا' اس لیے فقط اس مقصد کے لیے میں نے تھوڑی سی زنانہ چال چلی' یعنی بابی ساجدہ کے عزائم کو توڑ مروڑ کے ان کے سامنے پیش کیا۔

"وہ مجھے گھر داماد ہی نہیں' گھر بہنوئی بنانا چاہتی ہیں۔ گھر داماد تو ساس سسر کی شفقت کے سائے میں رہتا ہے۔ وہ مجھے اپنی اور اپنے میاں کی مٹھی میں رکھنا چاہتی ہیں۔ ان کے میاں کو ان کی اجازت کے بغیر اپنے ماں باپ سے ملنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ آپ بھی میری صورت دیکھنے کو ترس جائیں گی۔ اور کوئی جہیز بہیز نہیں ملنے والا۔ جب وہ مجھے ہی رخصت کروا کے لے جائیں گی تو آپ کے پاس کیا آئے گا۔ انا بینا بھی ہاتھ سے جائے گا۔"

بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ انہوں نے کوثر پہ ہی صبر شکر کیا کہ از کم وہاں سے کچھ تو امید تھی انہیں۔ میں نے یہ امید توڑنا فی الحال مناسب نہیں سمجھا۔ البتہ دل ہی دل میں پکا عہد کر لیا کہ مجھے اپنی بہنوں کو بیاہنا ہے۔ عزت سے بیاہنا ہے۔ مگر اپنے بل بوتے پہ۔ اپنے زور بازو پہ۔ اور اپنے ہی جیسے کسی نوجوان سے۔ جو نہ تو تن آسان ہو نہ شارٹ کٹ کا متلاشی۔ جو گھر بھرنے کے لیے نہیں بلکہ گھر بسانے کے لیے شادی کرے۔

"ڈھنچوں..... ڈھنچوں۔"

میں پتہ نہیں کب تک اپنے ہی اس کارنامے پہ مسکرا مسکرا کے خود کو داد دیتا رہتا کہ گدھے کی بے وقت کی راگنی نے خلل ڈال دیا۔

"کوثر! میں کہے دیتا ہوں' سمجھا لو اپنے چاچے نیم پاس کو۔ آج کے بعد اس گھر میں یا تو میں رہوں گا یا یہ گھوڑے دا پتر۔" میں نے دھمکی دی۔

"ہائے اللہ..... اتنی مہنڈ میں آپ کہاں رہو گے۔ سر تاج؟"

کوثر نے بھولپن سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے کہا تو میں منہ پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگا۔ ✱

خواتین ڈائجسٹ
کے خوبصورت ناول شائع ہو گئے ہیں
"ستاروں کا آنگن" نسیم حجازی
قیمت ——— 300/- روپے
"ڈھلے چاند دل کے پار" ثمرہ بخاری
قیمت ——— 300/- روپے
"اے وقت گواہی دے" راحت جبیں
قیمت ——— 300/- روپے
منگوانے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 - اردو بازار کراچی -